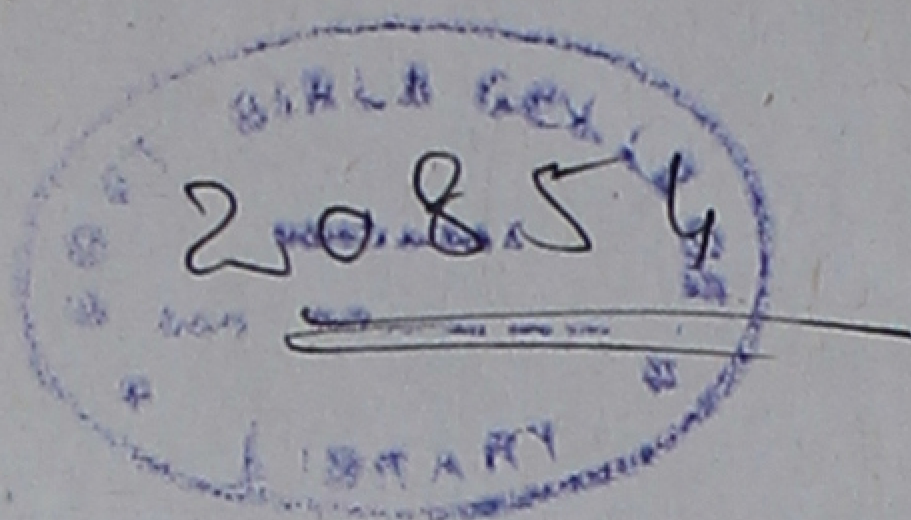




انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں جن لوگوں نے اردو غزل کے نشاۃ الثانیہ میں حصہ لیا ان میں حسرت موہانی اور فانی بدایونی کے ساتھ ساتھ اصغر گونڈوی کا نام بھی شامل ہے ان کے دو مختصر مجموعہ کلام "نشاط روح" اور "سرود زندگی" شایع ہو کر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

جناب ساجد صدیقی مالک مکتبۂ دین و ادب نے بڑی ہی محنت اور کاوش کے ساتھ ان کے سارے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کو اکٹھا کر کے کلیات کی شکل میں شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ اصغر کے فن اور فکر پر کچھ گرانقدر مضامین بھی ابتدائی حصہ میں شامل کئے ہیں۔

اصغر گونڈوی اپنے لب و لہجہ اور اپنے اشعار کی ماورائی فضا کی بنا پر نہ صرف اپنے معاصرین بلکہ اردو کے تمام شعراء میں منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔

ضرورت اس بات کی تھی کہ ان کے کلام کو یکجا کر کے نئے اہتمام کے ساتھ شائع کیا جاتا۔ ساجد صاحب نے یہ فریضہ انجام دے کر اردو ادب کے اوپر احسان کیا ہے۔

(ڈاکٹر) ملک زادہ منظور احمد
شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی
لکھنؤ
۲۳ مارچ ۱۹۷۱ء

کلیات اصغر گونڈوی



مرتب

ساجد صدیقی لکھنوی

یکے از مطبوعات شفاعت بکڈپو جافظ نشن مولویگنج لکھنؤ

مرتب .... ساجد صدیقی لکھنوی
باہتمام .... مطبع نظامی پریس شفاعت عمر
ناشر .... شفاعت بکڈپو۔ حافظ منشن مولوی گنج۔ لکھنؤ
طابع .... نظامی پریس، لکھنؤ
قیمت :۔ .... (علاوہ محصول ڈاک) بارہ روپے

ملنے کے پتے

شفاعت بکڈپو۔ حافظ منشن مولوی گنج لکھنؤ
تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی
شیخ غلام محمد تاجر کتب مائیسمہ بازار سرینگر کشمیر



دیوان رگھوناتھ خطیب سرحدی

اِنتساب

دیوان رگھوناتھ خطیب سرحدی

کے نام

جو حضرت اصغرؔ کے پرستار و شیدائی ہیں

ساجد صدّیقی

ترتیب





عطیہ جناب افضال احمد صاحب ایڈوکیٹ

جناب محترم۔ تسلیم و نیاز!

"ہندوستانی" کا ایک نمبر جناب کی خدمت میں ارسال کیا گیا تھا۔ غرض یہ تھی کہ آپ کوئی مضمون

اس کے لیے مرحمت فرمائیں۔ گو اب یہ سہ ماہی ہو گیا ہے۔ مگر ابتک یہ آپ کا عنایت نامہ موصول نہیں ہوا۔

ایک بار رولف احسن مارہروی کے یہاں آپ سے مشرف نیاز حاصل ہو چکا ہے،

شاید آپ کو یاد ہو۔ اسی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ اس درخواست کو بیجا تکلف نہ سمجھیں گے،

ورنہ اس کے لیے ڈاکٹر زبیر احمد صاحب کو سفارش کی تکلیف دیتا۔

مضمون کے لیے کوئی سا ادبی موضوع تجویز کرلیں۔ ہندوستانی اکیڈمی بھی حسب

تا مقدور معاوضہ بھی دیتی ہے۔ والسلام

نیاز مند

[illegible]

پروفیسر جناب نذیر احمد ایم۔ اے

شعبہ فارسی

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

حرفِ آغاز

اُردو بزمِ سخن جن چند مخصوص اربابِ کمال کی ذات پر بجا طور پر فخر کر سکتی ہے اُن میں ایک یگانۂ فن حضرت اصغرؔ گونڈوی کی ذاتِ گرامی بھی ہے جن کے کلام کی نازک خیالیاں درد آشنا قلوب کو ہمیشہ تڑپاتی رہیں گی۔ حضرت اصغرؔ گونڈوی کا اصل وطن گورکھپور ہے ضلع میں ہے لیکن حضرت اصغرؔ نے سکونت گونڈہ میں اختیار کر لی تھی جہاں ان کے والد منشی تفضل حسین صاحب ایک مدت سے قانون گو کے عہدے پر مامور تھے۔ ان کا پورا نام اصغر حسین ہے اور تخلص اصغرؔ یکم مارچ ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے اور ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء مطابق ۱۵ رمضان المبارک کو الہ آباد میں انتقال ہوا۔ اور دائرہ حضرت شاہ محب اللہ الہ آباد میں آسودہ خاک ہوئے۔

حضرت اصغرؔ گونڈوی کی ابتدائی تعلیم و تربیت معمولی اور غیر مستقل طور پر ہوئی۔ کچھ دنوں انگریزی اسکول میں تعلیم پاکر چھوڑ دی۔ انٹرینس کے امتحان کی تیاری کی لیکن خانگی پریشانیوں کی وجہ سے امتحان نہ دے سکے۔ تاہم اس تھوڑی سی مدت میں فطری صلاحیت کی وجہ سے اتنی استعداد پیدا ہو گئی کہ انگریزی کی ادبی کتابوں کا کافی لطف اٹھا لیتے تھے۔ یہی حال عربی، فارسی کا ہے۔ جو کچھ قابلیت پیدا کی وہ صرف ان کے ذاتی مطالعہ کتب اور غور و فکر کا نتیجہ ہے اور شاعری میں بھی حضرت اصغرؔ گونڈوی نے کسی کے سامنے مستقل طور پر زانوے تلمذ نہ تہ کیا۔ ابتداء میں کچھ دنوں منشی خلیل احمد صاحب وجدؔ بلگرامی کو اپنا کلام دکھاتے رہے آخر میں کچھ غزلیں منشی امیراللہ تسلیمؔ کو دکھائیں اس کے بعد سلسلہ

بند ہو گیا۔

شاعر کا اصل رہبر اس کا ذوق صحیح اور وجدان سلیم ہے جو رفتہ رفتہ اس کو مراد مستقیم پر ڈال دیتا ہے۔ حضرت اصغر گونڈوی ایک ممتاز شاعرانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ غزل گو شعراء پر ایک خاص اعتراض یہ بھی ہے کہ ان میں مسلسل نظم نگاری کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ لیکن حضرت اصغر گونڈوی کی ذات گرامی اس الزام سے بری ہے جس کا اندازہ صاحب ذوق "کلیات اصغر" کی ابتدائی نظموں سے لگا سکتے ہیں۔

حضرت اصغر گونڈوی کی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت خیالات کی پاکیزگی اور انداز بیان کی لطافت اور جدت ہے وہ ہمیشہ بلند اور لطیف جذبات و احساسات کی مصوری کرتے ہیں جہاں عام نگاہیں پہونچنے سے قاصر ہیں۔ حضرت اصغر گونڈوی اس دور کے ممتاز ہندوستان پاکستان ادیبوں اور شعراء کی نظر میں کیا حیثیت رکھتے تھے اور رکھتے ہیں ملاحظہ فرمائیں۔

"اردو میں ایک شاعر موجود ہے جس کی موجودگی سے میں اب تک بے خبر تھا۔ اصغر صاحب کے کلام میں حسن و خوبی پائی"

(مولانا ابو الکلام آزاد)

"حضرت اصغر گونڈوی کا کلام ہمارے دور کا ایک اعلیٰ ترین شاہکار اور اس کا مستحق کہ آج کل کے بہترین دل و دماغ اس سے لطف اندوز ہوں۔ اور امید کہ تعلیم یافتہ نوجوان اس کو پڑھ کر ایک اعلیٰ، پرجوش، اور پاکیزہ زندگی حاصل کریں گے"۔

(ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو)

"حضرت اصغر گونڈوی کا کلام اردو کی دنیا کے نظر میں بہترین شاہکار ہے

جو ہر حیثیت سے اس کا مستحق ہے کہ یونی ورسٹی کے اعلا درجے میں داخلِ نصاب ہو۔"
(علامہ اقبال سہیل)

"حضرت اصغر گونڈوی کے شعر کہنے کا خاص راز ان کا ذوقِ فارسیت ہے حضرت فارسی کی ترکیبوں کے خاص طور پر دلدادہ ہیں لیکن نکتہ سنج ہیں اس لئے ایسی لطیف ترکیبیں استعمال کرتے ہیں کہ جن سے شعر میں ایک خاص رعنائی اور دلکشی پیدا ہو جاتی ہے"
(مرزا احسان احمد بی اے)

"یہ ایک المیہ ہے کہ دنیا نے اصغر کو صرف ایک شاعر کی حیثیت سے جانا راقم السطور کی نظر میں اصغر صاحب سب سے پہلے ایک شریف اور قابلِ قدر انسان ایک بے ریا اور محبت کرنے والے دوست ایک بلند پایہ مفکر و ادیب اور اس کے بعد ایک خوش فکر شاعر تھے اگر میرے تاثرات کا خلاصہ اگر ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو صرف یہ کہنے پر اکتفا کروں گا کہ میں نے انھیں ہر حال میں "اصغر صاحب" پایا۔
(رشید احمد)

"اصغر گونڈوی ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک باعمل انسان بھی تھے۔"
(مولانا حفظ الرحمن)

اصغر عوام کے شاعر نہیں ہیں بلکہ ان کے کلام میں حسن و تاثیر سے لطف اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ آپ صاحب ذوق بھی ہوں

شاعر نہیں دنیا کا ہر شریف فن کار ریاض اور رکھ رکھاؤ چاہتا ہے۔ اصغر صاحب کی شاعری اسی کا نمونہ ہے اگر جدید اسکول اسے پسند نہیں کرتا تو یہ اصغر کا قصور

نہیں ہے قصور اردو معیار کا ہے۔ اصغر صاحب اپنے کلام کی جنت میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔"

(رشید احمد صدیقی)

اردو غزل میں اصغر کا مقام اور اس کی نوعیت متعین کرنا ذرا مشکل کام ہے انکی شاعری کا نسب نامہ مومن اور غالب سے ملتا ہے۔ کلام کا مطالعہ ہم کو بتاتا ہے کہ نہ وہ خود کسی کے مقلد تھے اور نہ آج تک کوئی ان کی تقلید کر سکا۔ وہ تنہا اپنی ہی دبستان میں ایسا دبستان جو استاد کا کوئی شاگرد رشید نہ پیدا کر سکا۔"

(مجنوں گورکھپوری)

"در اصل اصغر گونڈوی دورِ جدید کے ایک بڑے شاعر ہیں انہوں نے شاعری کو پست اور رکیک خیالات سے پاک و صاف کیا۔" (ڈاکٹر سلام سندیلوی)

"اصغر گونڈوی کو ملک عدم روانہ ہوئے ۲۳-۲۴ سال ہوئے لیکن آج بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ابھی زندہ ہیں اور ہم لوگوں میں ہنس بول رہے ہیں۔ اپنے اشعار سے سرمدی زندگی کی تانوں سے ہمارے مردہ دلوں میں نشاطی و انبساطی کیفیت پیدا کر رہے ہیں۔" (وصی احمد سندیلوی)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ماہ رمضان کا پہلا عشرہ رحمت اور دوسرا مغفرت اور تیسرا عشرہ جہنم سے آزادی کا ہوتا ہے۔ اصغر نے ۱۵ رمضان المبارک کو وفات پائی۔ کتنا خوش نصیب ہے اصغر۔

زیست بھی اُن کی رشک آور تھی — موت بھی رشک آفریں پائی
وسط رمضاں کی موت کیا کہنا — مغفرت تم نے بالیقیں پائی

(مولانا سراج احمد مچھلی شہری)

زیر نظر کتاب موسومہ کلیات اصغر گونڈوی ترتیب دیکر میں نے کوئی گرانقدر کتاب تصنیف نہیں کی بلکہ ان تمام احباب کے تقاضوں کو پورا کیا ہے جو مجھ سے اکثر و بیشتر فرمایا کرتے تھے کہ تم کلام اصغر گونڈوی کیوں نہیں چھپا دیتا۔ میں نے بار بار ان سے یہی کہا کہ ابھی میرے حالات اس کی اجازت نہیں دیتے اور پھر کلام اصغر بھی جمع کرنا تھا اب خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں نے اصغر گونڈوی کے کلام کو جمع کر لیا اور دونوں مجموعے "نشاطِ روح" اور "سرودِ زندگی" بھی حاصل کر لئے جو اب نہیں ملتے ہیں۔ میں نے کلیات اصغر گونڈوی میں "نشاطِ روح" اور "سرودِ زندگی" مع مقدموں، تبصروں و نقاریظ کے جمع کر دیا ہے جو آپ حضرات کے سامنے ہے۔ آخر میں میں ان تمام بزرگوں اور دوستوں کا شکریہ ادا کر رہا ہوں خصوصاً برادر محترم جناب سیٹھ مبین الدین۔ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد۔ مقرب نظامی۔ ہمسر قادری۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی۔ دیوان رگھوناتھ خطیب سرحدی۔ ڈاکٹر افضال احمد ایڈوکیٹ۔ ماسٹر مسرور۔ رشید قریشی۔ انجم ملیح آبادی۔ شاداں بارہ بنکوی۔ سرپٹ لکھنوی۔ اور محمد اسلم بسمل لکھنوی جنھوں نے اس سلسلے میں میری مدد فرمائی۔

ساجد صدیقی
باغ شیر جنگ متصل سٹی اسٹیشن لکھنؤ

اصغر صاحب

سید رشید احمد

دن جاتے دیر نہیں لگتی! چھپن برس کا طویل زمانہ گزر گیا! راقم سطور کو اصغر سے پہلے پہل ملنے کا اتفاق ضلع فیض آباد میں ۱۹۱۳ء میں اپنے عزیز دوست قاضی محمد حامد حسرت کے یہاں ہوا۔ حسرت نے اسی ضلع فیض آباد سے قیصر ہند نے نام کا ایک اردو ہفتہ وار اخبار جاری کیا تھا اور اسی کی ابتدائی ترتیب تدوین کے سلسلہ میں اپنے دوست اصغر گونڈوی سے ملنے گیا تھا۔ اس کے بعد یہ عجیب حسن اتفاق تھا کہ آغاز ۱۹۳۶ء میں پولیس افسر کی حیثیت سے گونڈہ میں میرا تعین ہو گیا۔ اور وہاں سب سے پہلے میں اصغر ہی کے یہاں مہمان ہوا وہ پولیس کوتوالی سے قریب ہی رہتے تھے۔ گونڈہ پہونچ کر ان سے اور بھی خصوصیت پیدا ہو گئی۔ اکثر صبح و شام صحبت رہتی۔ وہ بڑے مخلص اور محبت کرنے والے انسان تھے ان کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک اور جذب و کشش تھی جو دوسروں کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی تاہم ان کا رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ ان کے سامنے کسی کو اپنی حد سے تجاوز کرنے کی جرأت

ملازمت میں آنے سے پہلے میں گونڈہ میں ۱۹۳۰ء یعنی خلاف معمول قریب ۲۳ سال میں مامور رہا اور ۱۹۳۶ء کے اواخر میں اصغر کے انتقال سے صرف چند روز قبل وہاں سے دوسری جگہ تبدیل ہوا تھا۔ اس طویل المدت میں اصغر سے مجھے کافی قربت رہی۔ میں نے ان کو جلوت و خلوت اور اندھیرے اجالے سب ہی عالم میں دیکھا، اور میرے تاثرات کا خلاصہ اگر ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو صرف یہ کہنے پر اکتفا کروں گا کہ میں نے انھیں ہر حال میں اصغر صاحب پایا۔

جہاں تک ان کی شاعری کے گوناگوں محاسن اور ان سے انفرادیت کا تعلق ہے۔ اصغر کی شاعری پر ملک کے نامور اہل قلم اور فاضل نقادوں نے بہت کچھ لکھا ہے اور اس پر مجھ جیسا نااہل اور بے بضاعت انسان جس کی زندگی ادب کے بجائے سر بسر بے ادبی کے ماحول میں بسر ہوتی کب زبان کھولنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ اسی طرح ان کے سوانحیات پر بھی کافی لکھا جا چکا ہے اور ان کی زندگی کے تقریباً ہر گوشے پر لکھنے والوں نے روشنی ڈالی ہے اور ان کے محاسن کو اجاگر کیا ہے۔ تاہم اتنی طویل مدت تک اصغر کو قریب سے دیکھنے کا شاید کسی دوسرے لکھنے والے کو موقع نہیں ہوا۔ میرے طویل قیام گونڈہ اور اصغر سے ذاتی تعلقات کے پیش نظر بعض دوستوں کا اصرار ہے کہ میں بھی ان کی زندگی پر کچھ لکھوں۔ یہ پہلے عرض ہو چکا ہے کہ ملک کے اکثر نامور اہل قلم اصغر کے فن اور شخصیت دونوں پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں ایسی صورت میں محض ایک عامی کی حیثیت و نظریے میں ان کے کچھ حالات اپنے ذاتی علم و تحقیق کے موجب دوسروں کی تحریر پر کسی اضافہ و فوقیت کی نظر سے نہیں بلکہ احباب کے حکم کی تعمیل و نیز اپنے خلوص و عقیدت کی نذر کے طور پر ذیل میں قلمبند کرتا ہوں۔ چوں کہ ان کی شاعرانہ عظمت و بصیرت پر گفتگو مقصود نہیں لہٰذا مضمون کا عنوان بجائے اصغر گونڈوی کے محض "اصغر صاحب" رکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے اپنے ذاتی علم و مشاہدات و تحقیق اور خود اصغر سے معلوم کردہ حالات کی بنا پر لکھا ہے۔ عنواً

زمانہ اور حافظہ کی خرابی سے بلاشبہ اکثر چیزیں دھندلی اور فراموش ہو گئی ہیں۔ تاہم جو نقوش باقی رہ گئے ہیں ان کا ایک سرسری خاکہ مجملاً پیش کیا جاتا ہے۔ ایک ناکارہ اور ضعیف انسان سے جو زندگی کی تہتر دیں منزل طے کر رہا ہو اس سے زیادہ آپ کیا توقع کر سکتے ہیں۔ مضمون کی بے جا طوالت کے لئے البتہ اہل نظر سے معذرت خواہ ہوں۔ یہ طوالت کچھ تو بظاہر دراز کارانہ واقعات و تفصیلات کے اعادہ سے پیدا ہو گئی ہے، جن کا بیان ان کے سوانح نگاروں نے خاندان کے شایانِ شان نہیں سمجھا اور ان کی عظیم شخصیت سے فروتر جانا یا پھر جن کا انھیں علم ہی نہ ہو۔ راقم الحروف کی نظر میں اصغر کی سیرت کے یہی خدوخال ان کی عظمت کو چار چاند لگاتے ہیں۔ اور ان کے ذہنی ارتقا اور کردار کے رد عمل کا صحیح مرقع پیش کرتے ہیں۔ مضمون کی طوالت کا دوسرا سبب بالکل نفسیاتی ہے اور اس کی تفسیر ؎

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔

دُنیا میں سوائے انسان کے ہر چیز اپنا مخصوص اور متعین مقام رکھتی ہے۔ مگر انسان خود اپنا مقام پیدا کرنے کی ذمہ دار ہے۔ اس کا تمام شرف اپنے مقام کی تخلیق و تعمیر ہی میں مضمر ہے۔ اس کا مطالعہ و مشاہدہ اس کی ریاضتیں و مجاہدہ اس کی فکر و نظر اور اس کا تزکیۂ نفس، سب اس ایک مقصد کے حصول کے لئے ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقام کو معلوم و متعین کر سکے اسی تلاش و تجسس اور تشکیل و تعمیر میں اس کی ساری زندگی گزر جاتی ہے اور وہ عقل گریز پا کے فریب میں مبتلا رہتا ہے۔ اس کیفیت کی عکاسی اصغر نے اپنی اس غزل میں کی ہے ؎

اسی تلاش و تجسس میں کھو گیا ہوں میں
اگر نہیں ہوں تو کیونکر، جو ہوں تو کیا ہوں میں

کبھی یہ فخر کہ عالم بھی عکس ہے میرا
خود اپنا طرزِ نظر ہے کہ دیکھتا ہوں میں
کبھی خیال کہ ہے خوابِ عالمِ ہستی
ضمیر میں ابھی فطرت کے سو رہا ہوں میں
کہاں ہے سامنے آ مشعلِ یقیں لے کر
فریب خوردہ عقل گریز پا ہوں میں
ترا جمال ہے تیرا خیال ہے تو ہے
مجھے یہ فرصتِ کاوش کہاں کہ کیا ہوں میں

اصغر کی پوری زندگی آئینہ دار ہے کہ انھوں نے خدمتِ علم و ادب اور انسانیت کو اپنا گوہرِ مقصود بنایا جس سے بڑھ کر انسان کے لئے کوئی اور شرف نہیں ہے۔ ان کی شاعری میں شاعرانہ عظمت کے ساتھ کردار کی عظمت بھی پائی جاتی ہے۔ اس طرح اصغر بڑے شاعر ہی نہ تھے برگزیدہ انسانوں میں تھے۔ ان کی مقبولیت میں ان کے کردار کو بڑا دخل ہے۔ انھوں نے احساسِ جمال کو حیات اور کائنات کے سمجھنے کے لیے بطور قدر استعمال کیا ہے اور اپنے جذبہ و فکر میں ڈوبے ہوئے مدھر نغموں کو ایسی روح پرور اور نشاط افروز لے میں گایا ہے کہ ہم اس کے کیف سے سرشار ہو کر تھوڑی دیر کے لئے اس دنیائے آب و گل سے دور کسی تمنائی دنیا میں پہونچ جاتے ہیں جہاں وجدانِ مطلق کے سوا رسمی آداب و قیود کی حد بندیاں ختم ہو جاتی ہیں۔

میرے ۲۲ سالہ قیام گونڈہ کا بیشتر حصہ ایسا گزرا جس کے دوران اصغر گونڈہ ہی میں رہے تاہم اس میں قریب ۹، ۱۰ سال کا وہ زمانہ بھی شامل ہے جب ان کا قیام لاہور اور الہ آباد میں تھا۔ گونڈہ کی موجودگی کے دوران ان کے ساتھ خط و کتابت کا کیا محل تھا۔ البتہ ان کے

گونڈہ سے باہر قیام کی مدت میں خط و کتابت کا ضرور موقع ہوا۔ وہ خط و کتابت میں بڑے کاہل تھے تاہم ایک سرسری اندازے کے بموجب انھوں نے فوقتاً فوقتاً ۲۵۔۳۰ خطوط مجھے ضرور تحریر کیے، خطوط کے محفوظ رکھنے کا بھی کو خیال نہ تھا۔ اس طرح ان کا بیشتر حصہ ضائع ہو گیا ادھر دیکھنے پر ۱۰۔۱۲ خطوط کاغذات میں پڑے مل گئے۔ یوں تو بظاہر ان میں کوئی خاص بات نہیں پھر بھی دیکھنے پر ان میں کوئی نہ کوئی بات یادگار اور حکمت و بصیرت کی نکل آتی ہے اس لئے مضمون کے آخر میں ان کے چند خطوط کے اقتباسات بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں :۔

ذاتی مطالعہ

اصغر کا آبائی وطن گورکھپور تھا۔ ان کے والد منشی تفضل حسین ۱۸۸۳ء میں بسلسلۂ ملازمت گونڈہ آئے وہ یہاں کے قانون گو تھے۔ اصغر ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں دستورِ قدیم کے بموجب مکتب میں عربی فارسی اور اردو تعلیم حاصل کی۔ ان کے والد عربی اور فارسی میں اچھی لیاقت رکھتے تھے۔ خصوصاً فارسی کا مطالعہ ان کا کافی وسیع تھا۔ باپ کی توجہ سے بیٹے میں بھی فارسی سے رغبت پیدا ہو گئی۔ گھر میں فارسی کتابوں کا اچھا ذخیرہ موجود تھا انکے سوا کتب دینیات اور اردو مستند داستانیں بھی تھیں۔ جو اس عہد میں بار یہ تفریح سمجھی جاتی تھیں، منشی تفضل حسین قدیم مشرقی تہذیب و تمدن کا نمونہ تھے۔ کشیدہ قامت، خوشرو ادھیڑ عمر سے آگے نکلتے ہوئے، چہرے پر فرنچ کٹ وضع کی خوشنما داڑھی، بڑی بڑی روشن غلافی آنکھیں اور سر پر لمبے بالوں کے پٹے، کم سخن اور کم آمیز، فرصت کا سارا وقت مطالعہ میں بسر ہوتا کبھی کبھی افیون سے بھی شوق فرماتے۔ اصغر نے باپ کے چہرے کے تیکھے نقوش اور مسحور کن آنکھیں ورثہ میں پائی تھیں اور زندگی کے سفر میں آگے بڑھ کر انھوں نے باپ

ہی کی وضع قطع اختیار کی۔ اصغر نے فطری طور پر ذہن رسا پایا تھا، حافظہ بھی اچھا تھا، طبیعت میں
بلا کی شوخی، جودت و رسائی تھی۔ مکتبی تعلیم کے بعد ۱۸۹۸ء کے لگ بھگ وہ انگریزی تعلیم کے
لئے گورنمنٹ ہائی اسکول گونڈہ میں داخل ہوئے اور اردو فارسی کی کتابیں گھر پر باپ سے
پڑھتے رہے اس زمانہ میں انگریزی کا آٹھواں درجہ مڈل کلاس کہلاتا تھا، اور اس کا تعلیمی امتحان
بھی بورڈ سے ہوتا تھا انھوں نے ۱۹۰۳ء میں انگریزی کا درجہ مڈل پاس کر لیا تھا اور انٹرنس
میں پڑھ رہے تھے کہ ۱۹۰۶ء میں انگریزی تعلیم کا سلسلہ باپ کے ایما سے ختم کر دینا پڑا
اس زمانہ میں متوسط طبقہ میں لڑکوں کے لئے اتنی انگریزی پڑھ لینا روزی کمانے کے لئے کافی
سمجھا جاتا تھا۔ اور اس طبقہ کے نوجوانوں کی زندگی کا عموماً یہی منتہا اور مقصود ہوتا تھا۔ ہرچند
کہ خود اصغر ابھی انگریزی پڑھنا چاہتے تھے مگر ان کے باپ نے مزید انگریزی تعلیم کو غیر ضروری
سمجھا اور کہا کہ دفتروں میں جا کر کوئی ملازمت تلاش کرو اس طرح چار و ناچار انگریزی کا سلسلہ
ختم ہو گیا۔

گونڈہ بی۔ این۔ ڈبلو ریلوے کا ڈویژنل ہیڈ کوارٹر تھا۔ ان کے بڑے دفتر میں بابو راج
بہادر نامی ضلع سلطان پور کے رہنے والے ایک کائستھ ہیڈ کلرک تھے بڑے تیز طرار اور چلتے
ہوئے آدمی۔ اپنی انگریزی دانی کے سہارے ڈویژن میں مشہور۔ اور اس طرح انگریزی حکام
میں بہت با اثر و مقبول۔ وہ بڑے دلچسپ، یار باش اور رنگین مزاج آدمی تھے۔ کائستھ ہونے
کے ناطے کچھ اردو فارسی شعر و ادب سے بھی روشناس۔ اصغر تلاش روزگار میں ان کے پاس پہونچے
اصغر کی تلاش روزگار میں ان کے پاس پہونچے اصغر کی برجستہ گفتگو ذہانت و ذکاوت بذلہ سنجی سے
وہ کافی متاثر اور خوش ہوئے۔ انھیں اپنے ڈھب کا، دلچسپ و کارآمد آدمی سمجھ کر بڑا جہاد
ان کی حمایت پر کمربستہ ہو گئے اور حکام سے کہہ سن کر ان کو بیس روپیہ ماہانہ پر ریلوے

میں ٹائم کیپر مقرر کرادیا۔ اصغر فطرتاً بڑے ہوشمند اور فرض شناس انسان تھے۔ ملازمت کا حصول اس آسانی سے سر ہو جانے پر وہ بابو رجبہادر کی امداد و قدر دانی کے لئے بہت ممنون ہوئے اور انھیں اپنا محسن و شفیق سمجھ کر ان کے یہاں جانے آنے لگے چند ہی دنوں میں ان سے کافی دوستی اور بے تکلفی ہو گئی۔ راج بہادر عیاش اور پینے پلانے والے آدمی تھے۔ مے نوشی ان کی روزمرہ زندگی کے معمولات میں تھی۔ انھوں نے اپنا ایک حلقہ شبینہ قائم کر رکھا تھا جس میں ہر شام یار دوستوں کا جمگھٹا رہتا۔ کوئی کیسا ہی متقی پرہیزگار ہو ان سے بچ کر نہ جا سکتا۔ راج بہادر اسے سو حکمت و تدبیر سے شیشہ میں اتار لیتے غرض اصغر ابھی بالکل نوخیز و ناتجربہ کار تھے انھیں ایک دلچسپ اور بہتر شکار سمجھ کر جال بچھ گیا۔ راج بہادر جیسے گھاگھ اور گرگ باراں دیدہ کے چنگل سے سادہ لوح اصغر کیا بچ کر نکل سکتے۔ مختصر یہ کہ راج بہادر نے رفتہ رفتہ اصغر کو رام کر کے اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ نوبت یہ پہونچی کہ اصغر بادہ شبینہ کی سرمستیوں میں ایسے کھو گئے ایسے ہمہ تن غرق و شرابور ہوئے کہ حلقہ شبینہ کے سے آشناؤں پر سبقت لے جانے میں ان کا نام ہو گیا۔ راج بہادر نے ان کو عیاشی کی طرف بھی مائل کر دیا۔ اس فن میں شہر کے بعض خوشحال گھرانوں کے چشم و چراغ اور جانباز عشاق ان کے لالہ نما اور پیر طریقت بن گئے۔

کوچۂ جاناں

اودھ میں انتزاع سلطنت نے تلخیٔ دوراں کا غم غلط کرنے اور زوال پذیر تمدن کی خلش دلوں سے محو کرنے کے لئے جاگیردارانہ نظام کے تحت طرح طرح کے جو کھلونے اور دلچسپ مشغلے تیار کئے تھے ان میں رؤسا و امراء کی قدردانی اور سرپرستی کا مرکز ارباب نشاط کا وہ ایک طبقہ بن گیا جس سے قدردانیٔ فن کے پردے میں عشرت کوشی اور بوالہوسی کے جذبات کی کا کام لیا جاتا تھا۔ یہ طبقہ اتنی شائستگی اور ہنرمندی اور آداب مجلسی کے لئے مشہور ہوتے

میرے دیرینہ کرم فرما کنور وشنو ناتھ صاحب ایڈوکیٹ گونڈہ بار کے نہایت ممتاز اور
سینئر وکلا میں ہیں جو بفضلہ ابھی عمر کے اسّی سال پورے کر کے ۸۱ ویں سال سے گزر رہے
ہیں۔ اور جن کے لڑکے اب پرانے وکلاء میں شمار ہوتے ہیں) اصغر کے قدیم ترین دوستوں
میں زندہ موجود ہیں۔ راوی ہیں کہ وکالت پاس کرنے کے بعد جبکہ وہ بلرام پور سے ۱۹۰۹ء
میں پریکٹس کرنے کے لئے گونڈہ منتقل ہوئے ان کے رشتے کے بہنوئی بابو راجہ بہادر یہاں
موجود تھے، گونڈہ آتے ہی راج بہادر کے یہاں کنور صاحب کی... اصغر سے ملاقات
ہوئی بات چیت سے وہ بڑے زیرک و طباع و باغ و بہاری آدمی نظر آئے کنور صاحب
بھی بڑے ذی علم آدمی تھے انہیں اصغر سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ جہاں تک پینے پلانے کا تعلق
ہے کنور صاحب کا بیان ہے کہ وہ بالکل راج بہادر کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ راج
بہادر کے رشتے سے وہ جلد ہی کنور صاحب سے بے تکلف ہو گئے۔ حسن اتفاق سے گونڈہ
میں کنور صاحب نے اصغر کے پڑوس ہی میں اقامت اختیار کی۔ کنور صاحب اعلیٰ تعلیم یافتہ
ہونے کے سوا اردو فارسی شعر و ادب پر بھی اچھی نظر رکھتے تھے۔ اس طرح جلد ہی اصغر
اور ان کے باہم اخلاص و محبت کے تعلقات پیدا ہو گئے۔ کنور صاحب بھی ان ایام میں
شغل کے عادی تھے چنانچہ کبھی کنور صاحب کے یہاں دور ساغر چلتا اور کبھی راجہ بہادر
کے یہاں محفل عشرت جمتی، غرض کہ ان صحبتوں میں اصغر ان کے برابر کے شریک رسوم اور
ہم نوالہ و ہم پیالہ رہے۔ جن کی مے نوشی کی ابتداء کنور صاحب کے گونڈہ آنے سے
ڈیڑھ سال پہلے ہی راج بہادر کے یہاں ہو چکی تھی۔ اس حساب سے قریب ۵ سال
تک اور شغل مے نوشی جاری رہا اور اس خرابات عالم کا شکار رہے۔
کنور صاحب کا بیان ہے کہ ان کے دیگر رفقاء کبھی زیادہ پی کر اور کبھی شراب کی تیزی

سے بدحال ہو کر اکثر غیر ذمہ دارانہ حرکتیں کرنے لگتے اور اول فول بکنا شروع کر دیتے۔ مگر اصغر کی یہ عجیب خصوصیت تھی وہ خواہ کتنی ہی شراب پی لیں کبھی آپے سے باہر نہ ہوتے اور ہمیشہ اپنے ہوش و حواس پر قابو رکھتے۔ یہی نہیں بلکہ اس عالم میں بھی وہ مختلف علمی موضوعات پر بڑی دیدہ وری سے معقول و مدلل گفتگو کر سکتے تھے۔ چنانچہ کنور صاحب جو خود بھی اچھا تنقیدی شعور رکھتے تھے ناقل ہیں کہ کبھی کبھی نشہ کی حالت میں وہ دلچسپ مباحث چھیڑ دیتے اور اصغر اپنے بڑے زوروں کی روانی سے نقد و استدلال کے دریا بہا دیتے۔ کنور صاحب نے ایسے بہت سے مواقع کا ذکر کیا جن کے اکثر نازک مسائل و مباحث کو چھیڑ کر اصغر کی قوت نقد و استدلال کا دوستوں نے لطف و جائزہ لیا ہے۔ نمونتاً ۱۹۱۰ء کی ایک محفل شبینہ کے ذکر پر اکتفا کی جاتی ہے جو خود کنور صاحب کے یہاں برپا ہوئی تھی۔

دور ساغر چل رہا تھا اصغر جام پر جام لنڈھا رہے تھے وہ فوراً نشہ کے عالم میں کنور صاحب نے اصغر صاحب کو مخاطب کر کے کہا کہ ٹیگور کو گیتا نجلی لکھنے پر نوبل پرائز مل گیا۔ اقبال نے بانگِ درا لکھی جو بڑی معرکۃ الآرا چیز ہے مگر اس کی ایسی قدر نہ ہوئی، اس کا سبب کیا ہے؟ تو اصغر نے برجستہ کہا۔

"کیا تم نہیں جانتے کہ انگریز ہمیشہ سے چالاک مصلحت اندیش واقع ہوا ہے اس کے ہر اقدام میں خواہ وہ علمی یا عملی کسی سطح پر ہو یہی مصلحت اندیشی و سیاست کارفرما رہتی ہے۔ مسلمان اہل کتاب ہے۔ انگریز خود بھی اہل کتاب کی حیثیت سے ہر مسلمان سے چشمک رکھتا ہے۔ وہ کسی بھی جہت پر اس کی فوقیت و برتری گوارہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے موقعہ پر مسلمان کے مقابلہ میں دوسرے کو اچھال دینا ہی اس کی حکمت عملی اور سیاست ہے ورنہ گیت انجلی میں کیا ہے جو بانگ درا میں نہیں! یہ سب کہنے کی باتیں ہیں کہ گیت انجلی میں آن فات

ہے۔ اور بانگ درا میں آفاقیت کے پردے میں اسلام کی تبلیغ، اس لئے انگریز نے اسے لائق اعتناء نہیں سمجھا وغیرہ وغیرہ"

بات اپنی جگہ غلط سہی جو سہی بھی اس سے ہمیں کیا سروکار۔ کہنا صرف یہ مقصود ہے کہ دو خود نشہ اور سکر کے عالم میں جب لوگ عموماً دماغی توازن کھو کر ہذیان شروع کر دیتے ہیں، اصغر بڑی سنجیدگی اور شائستگی سے مختلف مباحث پر اظہار خیال کی قدرت رکھتے تھے۔ یہ ان کی سیرت کا کتنا بڑا کارنامہ ہے۔

کنور صاحب نے کہا کہ ہم سب کا علم اکتسابی یا کتابی تھا۔ اور اصغر کا وہبی۔ وہ اپنی فطری ذہانت و نظامت سے اکثر خفیف اشارات کی مدد سے دقیق مسائل کو حل کرنے اور انھیں ضبط و نظم کے ساتھ پیش کرنے کی مہارت رکھتے تھے۔

کنور صاحب کے قول کے بموجب یارانِ طریقت نے دورِ مے کشی کے اہتمام کا یہ دستور قائم کیا تھا کہ محفل شبینہ میں جس کے حصہ میں آخری جامِ شراب آتا۔ دوسرے روز کے شغل مے کا انصرام اسی کے ذمہ ہوتا۔ سالہا سال یہی نظام محفل قائم رہا۔ ستمبر ۱۹۱۲ء کے موسم سرما کی ایک تاریخی رات میں کنور صاحب کے یہاں محفل جمی ہوئی تھی، دورِ ساغر چل رہا تھا۔ خیام کے فلسفہ شراب اور اقبال کے اسرارِ خودی اور رموز بیخودی پر اصغر سے گفتگو چھڑی ہوئی تھی۔ اور وہ حسب معمول اپنے مخصوص عالمانہ انداز میں اس فلسفہ کے نکات و عوامض بیان کر رہے تھے، اور اس پر عبور حاصل کرنے کے لئے طہارت نفس کو شرط قرار دے رہے تھے۔ بیان کرتے کرتے ان پر کچھ عجیب ماورائیت کا عالم طاری ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خواب گراں سے کوئی یکایک جاگ پڑے اور نگاہ کے سامنے سے کوئی پردہ ہٹ جائے۔ اسی اثنا میں ان کے سامنے دورِ جام آ گیا۔ اصغر نے آبدیدہ

ہو کر جام شراب ہاتھ میں اٹھالیا، اور لوگوں کو مخاطب کر کے رقّت آمیز لہجے میں کہا "دوستو!
گواہ رہنا! اصغر کا یہ آخری جام شراب ہے۔ آج سے وہ مے نوشی سے توبہ کرتا ہے۔
خدا اسے معاف کرے اور اپنے عہد پر استقامت کی توفیق عطا فرمائے" ان کی اس
توبہ پر دوستوں نے بڑا قہقہہ لگایا، طرح طرح کے آوازے اور پھبتیاں کسی گئیں۔ کنور صاحب
کا بیان ہے کہ سارے احباب اصغر کے اس عہد کو ایک وقتی کیفیت اور تفریح و مذاق
سمجھتے تھے۔ مگر یہ امر واقعہ ہے کہ دوسرے روز یارانِ طریقت جب شغل مے نوشی
کے لئے جمع ہوئے تو اصغر نے پھر اس محفل میں قدم نہ رکھا۔ اور اپنے عہد کی پابندی کے لئے
سجدۂ نیاز میں رو رو کر بارگاہِ خداوندی میں توبہ و استغفار کرتے رہے۔ اور
ریلوے کی ملازمت بابو راج بہادر کی رفاقت، اور ان کے حلقۂ شبینہ پر شرکت سب
پر لات مار کر اپنے گھر جا بیٹھے۔ اور بی چھپّن کے ساتھ جو معاشقہ چل رہا تھا شرع کے
بموجب ان سے عقدِ مناکحت کر کے انھیں باقاعدہ اپنی شریکِ زندگی بنا لیا۔ اصغر کا یہ
فیصلہ وانتخاب ظاہری حسن اور شکل وصورت کے برعکس محض کردار وعمل کے باطنی اوصاف
کی بنا پر دہ کیا گیا تھا۔ جس کے نتیجہ میں ان کو کبھی پچھتانا نہیں پڑا۔ ان کی متاہلانہ زندگی
پرسکون وخوشگوار بسر ہوئی۔ ان کی بی بی کے ساتھ پورا گھر اس پیشہ سے تائب ہوگیا
جس کا سارا بوجھ اصغر نے باوجود اپنی بے سروسامانی کے اٹھالیا۔ بی بی نے جو پہلے سے
حسن شناس تھیں۔ اصغر کی توجہ سے کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ لیا اور نماز روزہ کی پابند
ہوگئیں۔ ان کی چھوٹی بہن نصیبن نے بھی بڑی بہن کا اتباع شروع کر دیا۔ الغرض اصغر
کے اس جراتمندانہ اقدام نے اس طائفہ رامش و رنگ کی یکسر دنیا ہی بدل ڈالی۔ اصغر
کی بی بی کو خانہ داری کے کاموں میں گھر کی ترتیب وصفائی اور کھانا پکانے کا اچھا

سلیقہ تھا۔ وہ معمولی دال روٹی کے پکانے میں بھی اپنی خوش ذوقی و ہنرمندی سے وہ لطف
و ذائقہ پیدا کر دیتیں جو دوسروں کے یہاں پلاؤ قورمہ میں بھی نصیب نہ ہوتا۔

کنور صاحب کا شغلِ مے نوشی عرصہ تک جاری رہا مگر اصغر اس ذہنی انقلاب
کے بعد انھوں نے پھر کبھی اصغر کو مے نوشی کی دعوت دینے کی جرأت نہ کی۔ ان کے اس عزم
و ثبات سے کنور صاحب کے دل میں اصغر کی عزت محبت روز بروز بڑھتی ہی گئی۔

ملازمت ریلوے کے دوران اصغر کچھ عرصہ تک (I.W.D) جرول روڈ کے تحت
بحیثیت ٹائم کیپر تعینات تھے ان کا ہیڈ کوارٹر جرول روڈ گونڈہ اور بارہ بنکی کے درمیان
دریائے گھاگھرا کے کنارے حدود ضلع بہرائچ میں ایک ریلوے اسٹیشن تھا۔ وہاں کا
(I.W.D) ایک شریف اینگلو انڈین تھا۔ اصغر بڑے خوددار اور رکھ رکھاؤ کے آدمی
تھے۔ وہ اپنے فرائض منصبی بڑی مستعدی، دیانتداری اور صفائی سے انجام دیتے اور
جس طرح وہ بڑے ہی ذکی الحس انسان تھے۔ اسی طرح وہ دوسروں کے محسوسات کا
بھی احترام کرتے جس کا نتیجہ تھا کہ اُن کا افسر اُن کے اصول اور خوبیوں سے واقف
ہو کر ان کی کافی عزت و قدر کرتا تھا۔ ریلوے اسٹیشن جرول روڈ ایک بالکل ویران و
غیر آباد مقام پر اصل قصبہ جرول ضلع بہرائچ سے چار میل فاصلہ پر واقع تھا۔ گونڈہ
سے جرول روڈ اسٹیشن صرف گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کی مسافت پر تھا۔ ریلوے کی ملازمت
میں آمد و رفت کی کوئی دشواری نہ تھی۔ اصغر کبھی وہاں رہتے کبھی گونڈہ چلے آتے اپنے
معمولی فرائض انجام دہی کے بعد جو تین چار گھنٹے میں تمام ہو جاتے انھیں فرصت ہی
فرصت رہتی وہ روزمرہ کے فرائض ادا کرنے کے بعد اپنا سارا وقت اردو و فارسی
اور انگریزی کے مطالعہ پر صرف کرتے۔ انگریزی سے ہنوز وہ بہت معمولی طور پر آشنا تھے

اور بطور خود انگریزی ادبیات کے مطالعہ کے اہل نہ تھے اس میں اُن کے اینگلو انڈین افسر نے جو اصغر کی فطانت شوق مطالعہ اور ذوق سلیم سے کافی متاثر تھا، اُن کی بڑی رہنمائی کی، وہ رفتہ رفتہ اصغر سے بہت مانوس ہو گیا تھا، اور ان کے شوق تحصیل علم کی قدر کرتا تھا۔ انگریزی ادبیات سے ابتداً جو کچھ واقفیت اور دلچسپی اصغر کو پیدا ہوئی وہ اسی کی تعلیم اور فیضان صحبت کا نتیجہ تھا۔ ان کی شاعری کی ابتداء ۱۹۰۶ء میں ہوئی تھی۔ انھوں نے ریلوے کی ملازمت کے دوران اپنے ذاتی مطالعے اور ذہن رسا کی مدد سے نہ صرف اردو فارسی میں کافی استعداد و لیاقت پیدا کر لی، بلکہ اپنے شفیق اینگلو انڈین کی مدد سے وہ انگریزی ادبیات سے بھی کچھ آشنا ہو گئے اور شعر و سخن کی مشق کے لئے بھی اچھا خاصا موقعہ مل گیا۔ ان کے مزدور جن کو ریلوے کی اصطلاح میں بارہ ماسی کہتے ہیں اپنے اصغر بابو سے بہت خوش اور مانوس تھے اس لئے کہ وہ پہلے کے بابوؤں کی طرح اُن کی مزدوری میں کوئی کاٹ کپٹ کرتے اور نہ اپنا کوئی حصہ بٹاتے۔ برخلاف اس کے وہ ان کی معمولی فروگزاشتوں اور حاضری میں دیر سویر کو نظر انداز کر دیتے اور وقت ضرورت ان کی مدد کرنے میں تامل نہ کرتے۔ ان کے بارہ ماسی اور ریلوے کے دیگر ملازم سب اُن کو اصغر بابو کہہ کر خطاب کرتے۔ رفتہ رفتہ ان کے گھر والے بھی سب ان کو بابو کہنے لگے۔ اس حد تک کہ جگر صاحب بھی جب ان کے خاندان کے ممبر بنے تو وہ بھی گھر والوں کی دیکھا دیکھی اصغر کو بابو صاحب کہنے لگے یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ یوپی کے اکثر اضلاع میں جس میں گونڈہ اور گورکھپور سب کا شمار ہے خوش باش ہندو مسلم گھرانوں میں نوجوانوں کو پیار و محبت سے عموماً بابو کہہ کر پکارتے ہیں جس میں محبت و تکریم دونوں طرح کے جذبات شامل ہیں۔

اصغر فطری طور پر بڑے منس مکھ، نکتہ رس اور دقیقہ سنج واقع ہوئے تھے اور اپنی خوش فکری اور طباعی سے ہمیشہ بات میں بات پیدا کرتے۔ ان میں فکر و جستجو کا غیر معمولی مادہ تھا۔ دوسری خصوصیت ان کی فطرت کی ان کی بے پناہ طنز و مزاح کی ندرت و تازگی میں مضمر تھی۔ وہ بحث و گفتگو کے دوران موقع پر ایسا بھرپور وار کرتے کہ مخاطب ان کے تیر و نشتر کا شکار ہو جاتا۔ ان کے مزاج میں سنجیدگی، شگفتگی، دل آویزی اور وارفتگی ہوتی۔ سبھی حالات میں حوادث کی سطحی اور خارجی شکل و صورت سے قطع نظر ہمیشہ ایک نئے زاویئے سے اپنے آپ کو پیش کرتے۔ ان کا طرز استدلال بڑا انوکھا و دلنشیں اور دقیق ہوتا۔ مزاج میں بڑی پختگی و پاکیزگی تھی، بڑے قانع و صابر تھے۔ تنہائی تکلیف میں بھی کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتے انھوں نے فارسی کتب کے مطالعہ کے ساتھ عربی کتابوں سے بھی استفادہ کی کوشش کی تھی۔

علامہ ابن عربی کی نصوص الحکم اور اسی قسم کی دیگر کتابیں اور انگریزی اور انگریزی میں آسکر وائلڈ وغیرہ کی تصانیف ان کے زیر مطالعہ رہی تھیں۔ اس طرح ان میں رفتہ رفتہ استدلال کا خاص ملکہ و شعور پیدا ہو گیا تھا۔ جو مطالعہ کی وسعت کے ساتھ بتدریج ترقی کرتا رہا۔ وہ نثر میں علامہ شبلی، ابوالکلام آزاد اور شاعری میں غالب مومن اور اقبال و حسرت سے متاثر تھے۔ مہدی افادی، سجاد انصاری اور اقبال سہیل کے بھی بڑے معترف اور مداح تھے۔

ان کی پہلی شادی موضع شاہ پور میں قاضی صاحبان کے ایک خاندان میں ہوئی تھی جو قصبہ نواب گنج ضلع گونڈہ کے مضافات میں دریائے سرجو کے کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اس شادی سے دو لڑکیاں پیدا ہوئیں، جو بیوی سے کسی باعث کشیدگی

پیدا ہو گئی اور وہ مدت العمر اصغر کے باپ کے ساتھ رہیں ۱۹۲۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا باعث کشیدگی کسی نے کبھی پوچھا تو یہ کہہ کر ٹال دیا۔ میاں بی بی کے معاملہ میں دوسرے کو دخل نہ دینا چاہیے۔

ادبی زندگی

اخبار قیصر ہند فیض آباد، جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، کے اکثر اداریے اصغر نے تحریر کئے تھے! وہ جنگ بلقان کا زمانہ تھا لوگ جنگ کی خبروں کے مشتاق و منتظر رہتے۔ اس کے بعد ہی پہلی عالم گیر جنگ چھڑ گئی۔ حامد حسرت ایڈیٹر قیصر ہند خود بھی اچھے ادیب و صحافی تھے۔ مگر اصغر کے اداریے جو نہایت متوازن اور حقیقت پسندانہ انداز میں تحریر کئے جاتے بہت بصیرت افروز ہوتے اور جو اخبار کی شہرت و مقبولیت میں بہت معاون ہوئے اور چند ہی دنوں میں اخبار خاصا چل نکلا۔ مگر اخبار کی محدود آمدنی کے پیش نظر اصغر کا فیض آباد میں مستقلاً قیام ممکن نہ تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد اخبار قیصر ہند پیغام کے نام سے فیض آباد سے نکلنے لگا۔ اسے بھی اصغر نے وقتاً فوقتاً فیض آباد میں عارضی قیام کر کے کامیاب بنایا۔ اصغر کی ابتدائی غزلیں اکثر و بیشتر قیصر ہند میں اور پیغام میں شائع ہو سکیں۔ بعض دیگر رسائل میں بھی وقتاً فوقتاً ان کا کچھ کلام شائع ہوا تھا۔ قاضی محمد حامد حسرت جب روزنامہ ہمدم لکھنؤ میں سید جالب دہلوی کے ساتھ کام کرنے کے لئے لکھنؤ چلے گئے تو اخبار پیغام کو کچھ دنوں تک اصغر نے زندہ رکھا، مگر جیسا کہ پہلے کہا گیا، پیغام کی محدود آمدنی اصغر کے مستقل قیام فیض آباد کے بار کی متحمل نہ ہو سکی اس لئے اخبار پیغام بند ہو گیا۔

ریلوے کی ملازمت ترک کر کے اصغر نے کچھ دن گھر پر بیکاری میں بسر کئے تاہم

ان کا ذاتی مطالعہ برابر جاری رہا۔ شعر و سخن سے انھیں فطری مناسبت تھی۔ وہ بچپن ہی سے
اکثر اساتذہ کے شعر گنگنایا کرتے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے کچھ پیوند کاری شروع کردی
اور ۱۹۰۶ء کے لگ بھگ وہ شعر کہنے لگے۔ چند روز کی مشق سے خاصہ ملکہ پیدا ہوگیا
عہد قدیم میں خیر و بلی ضلع بہرائچ مسکن شرفاء کا ایک مردم خیز مشہور قصبہ تھا جہاں
گونڈہ کے مقابلہ میں شعر و سخن کا زیادہ چرچا تھا اور جہاں اکثر بڑے صاحبان علم و فن پیدا
ہوئے۔ انھیں کی باقیات میں سید علی حیدر صاحب دل تعلقدار تبہ دل تھے ان سے
اصغر کے مراسم پیدا ہوئے۔ حضرت دل بڑے قادر الکلام اور زود گو شاعر تھے۔
ان کی فکر سخن کا انداز یہ تھا کہ حقہ بھر کر سامنے رکھ دیا گیا اور مصرع طرح پیش ہوا
وہ حقہ کا کش لے کر آنکھیں بند کر لیتے اور ہر کش پر شعر نازل ہوتے چلے آتے۔ ان کی بزم
سخن شاعری کا اکھاڑہ بن جاتی جس میں زبان و بیان اور ردیف و قافیہ کے عجیب
کرتب داؤں پیچ اور بینترے دکھائے جاتے۔ اور یاران نکتہ داں کے لئے عرض ہنر
کی صلائے عام ہوتی۔ شعر کی لطافت و پاکیزگی اور معنویت سے چنداں سروکار نہ ہوتا۔ اصغر
قادر الکلامی اور قوت نظم کے اس معرکہ و نمائش سے بہت لطف اندوز ہوتے اور
جب کبھی موقع ہوتا اپنے دوستوں کو بھی تفریحاً یہ تماشہ دکھاتے۔ چنانچہ مجھے بھی
کئی بار اس تماشہ کو دیکھنے کا گونڈہ میں اتفاق ہوا۔ ایک بار "گرمیاں حلیم میں کتا کو"
"بیابان حلیم میں کتا کو" کی ردیف و قافیہ میں حضرت دل نے عجیب و غریب شعر نکالے
تھے۔ ان اشعار کی غرابت پر کیوں کر کہوں اپنے حافظہ پر خدا کی مار ہو کر اس وقت
ایک شعر بھی مسلم یاد نہیں۔ مایہ تفنن طبع ہونے کے سوا بظاہر اس رنگ سخن سے اصغر کو
کیا واسطہ تھا۔ اصغر نے اپنی شاعری کا بالکل اچھوتا انداز اختیار کیا۔ جو وحدت کے عالم

رنگ سے بالکل مختلف تھا انھوں نے چند ابتدائی غزلیں ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۱ء کے درمیان منشی امیر اللہ تسلیم کو خط و کتابت کے ذریعہ دکھائی تھیں۔ ورنہ درحقیقت خود ان کا مذاق سلیم ان کا رہنما تھا۔

تجارت

ہرچند کہ اصغر کے یار دوستوں کا حلقہ بہت محدود تھا۔ تاہم ان میں اکثر ان کے مخلص دوست اور ان کی سیرت کی گوناں گوں خوبیوں کے قدرداں بھی تھے۔ وہ ریلوے کی ملازمت ترک کر کے گھر آ بیٹھے تھے۔ ان کی بے کاری کے پیش نظر بعض احباب کی رائے ہوئی کہ وہ تجارت کریں۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے کچھ سرمایہ کا انتظام کر کے چوک بازار گونڈہ میں انھیں لباس خانے کی ایک دوکان رکھوا دی جہاں صبح و شام یار دوستوں کا جمگھٹا رہتا پان سگریٹ اور چائے کے دور .... چلتے۔ دوکان کیا تھی چوک بازار میں دوستوں کے بیٹھنے، سیر و تفریح و گپ بازی کا ایک اڈہ تھا یا ٹھکانہ بن گیا تھا۔ شعر و سخن یا علمی مذاکرات سے اصغر کو فطری لگاؤ تھا۔ اکثر قدیم و جدید شعراء کے کلام اور دیگر علمی موضوعات پر دوستوں کی صحبت میں نقد و تبصرہ کی محفل گرم ہوتی، بڑی موشگافیاں ہوتیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ حلقہ احباب میں اصغر کی ذہانت و فطانت کے مقابلہ میں ان کا کوئی ہمسر یا حریف نہ تھا۔ لے دے کر قدیم اسکول کے ایک ذی علم دوست حکیم عبدالباری انصاری تھے جو اپنے کتابی علم کے سہارے اصغر کے ساتھ کچھ دور چلتے مگر آگے بڑھ کر ان کی راہ روایتی مولوی کی راہ میں ضم ہو کر ترکستان چلی جاتی تاہم اپنے فلسفہ اور منطق کے زعم میں کبھی کبھی اپنے انا کے گھوڑے پر سوار ہو کر اصغر کو آنکھ نہ دکھاتے ہوئے عالم بالا کی سیر کو نکل جاتے ورنہ اور تو لوگ نیاز مند قسم ہی کے لوگ تھے جو دو دو

چار قدم سے زیادہ چلنے کی تاب و سکت نہ رکھتے جید اہل فکر و نظر حضرات بھی بوجہ کثرت مشاغل کے
کے باعث بزم احباب میں شرکت کا وقت نہ رکھتے۔ کبھی کبھار ہی انھیں کسی مسئلہ میں اصغر
سے الجھنے کی نوبت آتی۔ مگر حق یہ ہے کہ ان معرکوں میں بھی میدان عموماً اصغر ہی کے ہاتھ رہتا
وہ ایسے عالی ظرف، بے ریا اور باغ و بہار انسان تھے کہ گرد کدورت سے کبھی ان کا دامن
آلودہ نہ ہوتا۔ اور ان کا حریف و مخالف بھی ان کی محفل سے رطب اللسان ہی اٹھتا۔ حکیم عبدالباری
انصاری حضرت قاضی عبدالغنی منگلوری رحمۃ اللہ علیہ مشہور صوفی بزرگ کے مرید تھے۔ اصغر نے
بھی حضرت سے بیعت ہونے کا شرف حاصل کیا۔ انھوں نے اپنے کشف سے اصغر کے
جوہر ذاتی اور بے پناہ فطری صلاحیتوں کو تاڑ لیا۔ اور ان پر توجہ خاص فرمانے لگے۔ اصغر
کی شیفتگی اپنے پیر سے دن بدن بڑھتی گئی۔ مرشد کے فیض روحانی سے ان کی تو دنیا ہی بدل گئی۔
اور ان میں وہ گداز قلب پیدا ہو گیا جس سے اعماقِ روح میں جلا ہو جاتی ہے۔

اصغر کی دوکانداری کا حشر بھی سن لیجئے! ہندوستانی روایتی دوکانداری کے جو گُر ہیں
اور گاہکوں کی نفسیات کا جائزہ لے کر ان کو جھوٹ سچ بیانات سے خریداری پر جس طرح مائل
کیا جاتا۔ یا پھنسایا جاتا ہے یہ دروغ بیانی اصغر کے بس کی بات نہ تھی۔ اصغر نہ صرف اس
سے بیگانہ تھے بلکہ اسے مذموم اور ناجائز سمجھتے تھے اس لئے ان کی دوکانداری میں گھاٹے
کے سوا رکھا ہی کیا تھا۔ چنانچہ اس کا یہی حشر ہوا کہ سال دو سال کے اس کاروبار میں کسی
نفع و ترقی کے بجائے رفتہ رفتہ دوکان یار دوستوں کی خاطر تواضع کی نذر ہو گئی اور جو
کسر باقی رہی تھی اسے فہرست باقی داروں نے پوری کر کے حساب صاف کر دیا۔

گونڈہ کی ادبی محفل میں جگر غالباً ۱۶-۱۹۱۶ء میں روشناس ہو چکے تھے اور ان کے
نقد کا امتحان بھی بعض نکتہ چیں ارباب ذوق لے چکے تھے اصغر نے ان کے جوہر ذاتی کو

پرکھول دیا تھا اور باوجود ان کی رندی و سرمستی کے اُن سے محبت کرنے لگے تھے۔ رفتہ رفتہ جگر پر اصغر کی نظر التفات زیادہ ہوتی گئی۔ اور ان کی گرفتاری کے لئے کچھ طوق وسلاسل تیار کئے جانے لگے۔ اور جس کے نتیجہ میں بالآخر اصغر کی سالی نصیر کے ساتھ (جس کا نام بعد میں لوگوں نے شاعرانہ تصرف کے ذریعہ نسیم رکھدیا) جگر کا عقد ہو گیا۔ اصغر کی عظیم شخصیت وکردار اور اُن کے خلوص و محبت سے جگر بہت متاثر تھے اور ان کا بڑا ادب و احترام کرتے تھے اور شاید اسی جذبے کے تحت انہوں نے یہ رشتہ بھی قبول کیا تھا ورنہ ان کی فطرت آزاد و رند مشرب اس قسم کی رسمی قیود اور پابندیوں سے ہنوز ہمکنا نہ تھی۔ اور پھر اپنے اس دور نشاط کے عالم میں انھیں ایسے تعلق کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا ہوش بھی کہاں تھا۔ کہنے کو تو انھوں نے گونڈہ والی بیڑیاں وقتی دلچسپی کے طور پر پہن لی تھیں مگر اپنی رند مشربی کے دیگر علائق کو جو گونڈہ سے کہیں زیادہ رنگین تابناک دوسری جگہ موجود تھے وہ کیونکر فراموش کر سکتے تھے۔ چنانچہ جب کبھی انھیں گونڈہ کی قید و بند سے آزادی نصیب ہوتی وہ جی بھر کر اس کا انتقام لینے میں نہ چوکتے اور ایسے گم و لاپتہ ہوتے کہ مدتوں گونڈہ والوں کو ان کا سراغ نہ ملتا جس کا لازمی نتیجہ تھا کہ ان کی بی بی ان سے برگشتہ ہو گئیں۔ ان کو جگر کی اس آزادروی کی بھی کچھ سن گن مل گئی تھی جس نے انھیں اور بھی برافروختہ کر دیا۔ یہ چیز عورت کی فطرت کے لحاظ سے ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ اس لئے وہی ہوا کہ انھوں نے مرض لاعلاج سمجھ کر جلد ہی سال میں جگر سے طلاق حاصل کرلی۔ ان واقعات وحوادث کے باوجود اصغر اور جگر کے باہمی تعلقات میں کوئی فرق نہ آیا۔ اصغر بڑے عالی ظرف انسان تھے۔ وہ انسانی کمزوریوں کی پذیرائی میں بڑے فراخ دل تھے۔ ان پر خود کچھ عرصہ تک یہی عالم طاری رہ چکا تھا اس لئے یہ سب کچھ ہونے کے بعد بھی وہ

جگر کو ویسا ہی عزیز رکھتے تھے۔ اس سے جگر کی نظر میں اصغر کا ادب و احترام اور بھی بڑھ گیا تھا۔ وہ جگر کی بے راہ روی پر ہمیشہ ہنس کر یہی کہتے تھے کہ تم دنیا میں چاہے جہاں مارے مارے پھرو تم کو بالآخر ایک دن یہیں آنا پڑے گا۔ چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ اصغر کی یہ پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ جگر بدستور اصغر کے ساتھ گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے رہے اور اپنا کاروبار کرتے رہے۔ نکاح و طلاق کا یہ افسانہ کبھی ان کے ذاتی تعلقات کی راہ میں حاصل نہ ہوا۔ اصغر نے جگر کو بھی حضرت قاضی صاحب منگلوری کے حضور میں پیش کر کے داخل سلسلہ کرا دیا۔ جگر جب کبھی مرشد کی خدمت میں حاضر ہوتے قاضی صاحب ان کو ہمیشہ اصغر ہی کے پاس بھیج دیتے۔ اس طرح جگر اور اصغر کا روحانی رشتہ اور بھی استوار ہو گیا۔

جگر ایک مدت سے بی۔ ین۔ سیجل کمپنی چشمہ سازانِ آگرہ کے بصری نمائندے کی حیثیت سے کام کرتے تھے وہ جہاں جاتے اپنی شاعری کے طلسم اور دلنوازی سے سامعین کے دلوں کو مسخر و مسحور کر لیتے۔ اس طلسم بندی کے باوجود اپنی زندگی و سرمستی کے اپنے پیشہ میں ہر جگہ بہت کامیاب رہتے انھیں چشمہ کی تجارت کا کافی تجربہ ہو گیا تھا۔ اور یو۔پی کے مختلف شہروں کا برابر دورہ کر کے وہ بڑی مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ بالآخر جگر نے اصغر کو بھی چشمہ کی تجارت پر مائل کیا اور آگرہ کے کارخانہ کی نمائندگی ترک کر کے اصغر کے ساتھ خود اپنا کام کرنے لگے۔ جس کی یہ صورت قرار پائی کہ جگر حسب معمول باہر سفر کر کے آرڈر حاصل کرتے اور اصغر گونڈہ میں قیام کر کے ان آرڈروں کی تعمیل کرتے۔ چنانچہ سات سال تک اس تجارت کا سلسلہ قائم رہا اور اس صورت سے خاندان کی پرورش ہوتی رہی۔

جہاں تک شاعری کا تعلق ہے جگر سے تو جب جی چاہتا فرمائش کر کے ان کا کلام سن لیا جاتا مگر اصغر سے باوجود ہر وقت کی ہم نشینی اور بے تکلفی کے میں نے کبھی شعر سنانے کی فرمائش نہیں کی۔ جب کبھی وہ موڈ میں ہوتے تو خود کہتے "سنو! ایک شعر ہوا ہے! یا یہ غزل ہوئی ہے!" اور پھر ایک دلنواز ترنم سے اسے سناتے اور دوسروں سے شاید زیادہ وہ خود اس کے کیف و سرور سے لطف اندوز ہوتے۔ وہ شعر خود اپنی نشاطِ رُوح کے لئے کہتے تھے۔ مشاعروں میں دادخواہی کے لئے نہیں، ان کی اکثر غزلیں مجھے یاد ہو گئی تھیں۔ میں نے اُن کی بعض غزلیں ایک مشہور ریڈیو فاضل مستشرق مسٹر ڈبلیو۔ ڈی ہرسٹ (آئی۔ سی۔ ایس) کو جو ۱۶-۱۹۱۵ء میں گونڈہ کے ڈسٹرکٹ و سشن جج تھے پڑھ کر سنائی تھیں۔ وہ سن کر جھوم جھوم گئے تھے اور مجھ سے کہا تھا کہ کبھی ان کو یہاں لائیے۔ میں نے جب کبھی اصغر سے جج صاحب کے یہاں چلنے کے لئے کہا۔ وہ ہوں ہاں کہہ کر ٹال گئے۔ کبھی ان کے یہاں نہ گئے، احساس کمتری کی بنا پر نہیں! بلکہ انھوں نے فطرتاً طبیعت ہی ایسی پائی تھی جو جلوت کے ہنگاموں سے ہمیشہ دور رہتے، اور شاعر کی حیثیت سے اپنے آپ کو کسی کے سامنے پیش کرنے میں اجتناب کرتے۔ اصغر نے اپنے خطوط میں بھی جو انھوں نے قیام لاہور اور الہ آباد کے دوران مجھے تحریر کئے کبھی کبھی اپنے تازہ اشعار لکھے تھے۔

اصغر اکثر مشاعروں کی شرکت سے اجتناب کرتے اور اپنے احباب کو بھی ہر مشاعرہ میں شعر کہہ کر لے جانے سے منع کرتے وہ کہتے کہ مشاعرہ میں وہی شعر اٹھتا ہے جو سب کی سمجھ میں جلد آ جائے۔ اور ایسا شعر معمولی ہی سطح کا ہوتا ہے۔ اصغر کا کلام اُس دور کے عام شعراء سے مختلف ہوتا۔ اگر وہ کسی مشاعرے میں شریک بھی

ہوتے تو ان کی غزل دوسرے لوگ پڑھتے تھے۔ مجھے ان کے چند خاص مشاعروں کی شرکت اب تک یاد ہے ان میں پہلا طرحی مشاعرہ ۱۷-۱۹۱۸ء میں فیض آباد میں ڈاکٹر خادم حسین اور قاضی محمد حامد حسرت کے زیر اہتمام ہوا تھا۔ جس میں حسرت نے اصغر اور جگر دونوں کو اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر گونڈہ سے کھینچ بلایا تھا۔ منشی محمد حسین حسن وکیل سرکار فیض آباد صدر مشاعرہ تھے اور مصرع طرح تھا ؎

کیوں پیر فلک تو نے آہوں کا اثر دیکھا

جگر نے طرح میں غزل نہیں کہی تھی۔ اصغر کی یہ طرحی غزل جگر نے پڑھی تھی۔ اس کے بعد اپنی چند غزلیں سنائی تھیں

اس کا وہ قدر عنا، اس پردہ رخِ رنگیں ۔۔۔ نازک سا سر شاخ اک گویا گلِ تر دیکھا
تم سامنے کیا آئے اک طرفہ بہار آئی ۔۔۔ آنکھوں نے مری گویا فردوس نظر دیکھا
ہر ذرہ میں صحرا کے بیتاب نظر آئی ۔۔۔ لیلیٰ کو کبھی مجنوں نے یوں خاک بسر دیکھا
ہاں! وادیٔ ایمن کے معلوم ہیں سب قصے ۔۔۔ موسیٰ نے فقط اپنا اک ذوق نظر دیکھا

صدر مشاعرہ حضرت حسن کا نمونتاً ایک شعر ؎

بے لوث نہ بلبل کا عشق گلِ تر دیکھا
عاشق ہوئی مٹھی میں غنچوں کے جو زر دیکھا

حسرت کی غزل کا ایک شعر ؎

نظروں کے تصادم سے آگ نہ لگ جائے
میں نے جو ادھر دیکھا اُس نے بھی ادھر دیکھا

دوسرا غیر طرحی مشاعرہ اواخر ۱۹۲۰ء میں میری تحریک پر لائل کالجیئیٹ اسکول

ہرّ موپور ضلع گونڈہ میں آنریبل مہاراجہ بھگوتی پرشاد سنگھ صاحب کی صدارت میں ہوا تھا۔ جس میں اصغر اور جگر دونوں شریک تھے۔ دو غزلیں اصغر کی اور تین چار غزلیں اپنی جگر سے پڑھوائی گئی تھیں۔ جگر نے اپنے نادر کلام اور سحر آفریں ترنم سے محفل میں عجیب سماں پیدا کر دیا تھا۔ اُن کے آتشیں نغمہ کی گونج سے ایوانِ مشاعرہ کے در و بام تک جھوم رہے تھے۔ اس مشاعرہ کی اصغر اور جگر کی ایک ایک غزل کے چند اشعار نمونتاً ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

اصغر

نہ یہ شیشہ نہ یہ ساغر نہ یہ پیمانہ بنے
جانِ میخانہ تری نرگسِ مستانہ بنے

پرتوِ رخ کے کرشمے تھے سرِ راہ گذر
ذرّے جو خاک سے اٹھے وہ صنم خانہ بنے

خاکِ پروانے کی برباد نہ کر بادِ صبا
یہی ممکن ہے کہ کل تک مرا افسانہ بنے

رند جو ظرف اٹھا لیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

جگر

نیاز و ناز کے جھگڑے مٹائے جاتے ہیں
ہم اُن میں اور وہ ہم میں سمائے جاتے ہیں

شروعِ راہِ محبت! ارے معاذ اللہ!
یہ حال ہے کہ قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

الٰہی ترکِ محبت بھی کیا محبت ہے
بھلاتے ہیں انھیں وہ یاد آئے جاتے ہیں

مری طلب بھی اسی کے کرم کا صدقہ ہے
قدم یہ اٹھتے نہیں ہیں اٹھائے جاتے ہیں

تیسرا عظیم الشان طرحی مشاعرہ جشنِ پنجاہ سالہ جوبلی علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں آخر ہفتہ دسمبر ۱۹۲۵ء میں علی گڈھ میں ہوا جو صحیح معنی میں آل انڈیا مشاعرہ تھا اور جس میں ملک کے مشہور شعراء شریک ہوئے تھے۔ اس مشاعرہ کی بہترین غزل

طلائی تمغہ عطا کئے جانے کا اعلان کیا گیا تھا۔ اصغر سے بہت کہہ سن کر مشاعرے کی طرح میں غزل لکھوائی گئی تھی۔ جگر ان ایام میں گونڈہ سے لاپتہ تھے۔ اصغر کی غزل کا جگر سے بہتر پڑھنے والا اور کون ہو سکتا تھا۔ میں نے ان کی بڑی جستجو کی۔ پتہ چلا کہ حضرت مین پوری میں جلوۂ طور کے مشتاق اپنے دوست اصغر حسین صاحب ایڈوکیٹ کے یہاں پڑے ہوئے ہیں۔ اس سرزمین سے جگر کی زندگی کی بعض رنگین روایات وابستہ تھیں۔ چنانچہ میں نے جگر کو اصغر کی معیت میں اپنے سفر کان پور و علی گڈھ کے پروگرام کی اطلاع دیتے ہوئے تاکیداً تحریر کیا کہ وہ جشن جوبلی علی گڈھ میں ہم لوگوں سے ملیں۔ نیز یہ بھی لکھ دیا کہ مشاعرے میں اصغر کی غزل انھیں کو پڑھنا ہوگی۔

اصغر کا پہلا مجموعہ کلام نشاطِ روح، مرزا احسان احمد اور مولانا اقبال احمد سہیل کے زیر اہتمام مطبع معارف اعظم گڈھ سے اوائل دسمبر ۱۹۲۵ء میں بڑی عجلت میں شائع ہوا۔ جشن جوبلی کے موقع پر اسے پیش کرنا مقصود تھا۔ وقت کی تنگی کے سبب خود یہ حضرات اعظم گڈھ سے نشاطِ روح کے مطبوعہ نسخوں کی ایک بڑی تعداد اپنے ساتھ لے کر روانہ ہوئے۔ میں اصغر کے ساتھ گونڈہ سے لکھنؤ پہونچا۔ اعظم گڈھ کے دوستوں کا لکھنؤ میں ساتھ ہو گیا۔ جہاں سے ہم سب اولاً کانپور گئے۔ وہاں انڈین نیشنل کانگرس اور مسلم لیگ کے اجلاس ساتھ ساتھ ہو رہے تھے۔ کانگرس اور لیگ میں اس زمانہ میں باہم اتحاد تھا۔ کانگرس کے اجلاس کی صدارت مسز سروجنی نائیڈو نے کی تھی اور مسلم لیگ کی غالباً علی برادران نے۔ سروجنی نائیڈو کا خطبہ صدارت بہت جامع و بلیغ اور انداز بیان بہت دل کش اور دل آویز تھا۔ کان پور کے مختلف اجلاسوں میں دو دن شرکت کے بعد ہم لوگ علی گڈھ پہونچے۔ کچھ لوگوں نے پروفیسر

رشید احمد صدیقی کے یہاں قیام کیا اور کچھ دوسرے کیمپوں میں ٹھہرائے گئے۔

جشن جوبلی وائس چانسلر کی کوٹھی سے متصل عریض وطویل میدان میں (جہاں اب آزاد لائبریری تعمیر ہو گئی ہے) نہایت عالیشان پنڈال میں منایا گیا تھا۔ کرسیوں پر نشست کا انتظام تھا۔ تقریباً سارے بڑے جلسے اسی پنڈال میں ہوئے تھے۔ کالج کے ٹرسٹی صاحبان و دیگر مہمانان کثیر تعداد میں ملک کے ہر گوشے سے شرکت کے لئے آئے تھے۔ یونیورسٹی کے طلباء کی تعداد اس پر مستزاد تھی۔ اس طرح مشاعرے کی شب میں پنڈال حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تل دھرنے کی بھی جگہ باقی نہ تھی کئی ہزار سامعین کا اجتماع تھا۔ لاؤڈ اسپیکر اس وقت تک ایجاد نہ ہوا تھا۔ ایک انسان کی مجرد آواز اتنے بڑے مجمع کے لئے کسی طرح کافی نہ تھی۔ طلبا کو قاعدہ کے بموجب مہمانوں کے پیچھے کی نشستوں پر جگہ دی گئی تھی۔ اور وہی سبب سے زیادہ شعراء کی غزل سرائی سے لطف اندوز ہونے کے لئے مضطرب و بے چین تھے۔ مجمع میں پوری طرح سکون قائم رہتا تو ممکن تھا کہ کچھ نہ کچھ آواز پیچھے کی نشست والے بھی سن سکتے۔ مگر طلباء نے شروع ہی سے وہ ہنگامہ برپا کیا کہ پاس والے بھی شاعر کا کلام سننے سے محروم رہے۔ صدر مشاعرہ آنریبل سر علی امام کو کئی بار طلباء سے اپیل اور پھر فہمائش و تہدید کرنا پڑی۔ اس کے باوجود خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ محفل میں اختلال و انتشار کی یہ صورت تھی کہ اچھے سے اچھے شاعر بھی ڈائس پر جا کر ناکام واپس آئے۔ خواجہ مسعود علی ذوقی جو اس زمانہ میں طالب علم تھے، مشاعرہ کے اناؤنسر یا سکریٹری تھے۔ اسی ہڑبونگ کے عالم میں اصغر کی غزل پڑھنے کا نمبر آگیا اور جگر اسے پڑھنے کے لئے ڈائس پر گئے سارے حاضرین ہمہ تن گوش تھے۔ مطلع شروع ہی کیا

تھا کہ لڑکوں نے سن نہ پانے کی وجہ سے شور و غل سے ایک قیامت برپا کر دی۔ صبر و سکون سے کام لیتے تو ممکن تھا کہ کچھ آواز پیچھے والوں تک بھی پہونچ جاتی مگر طلبار کو اس کی تاب کہاں! نتیجہ یہ ہوا کہ جگر اس بیہودگی سے منغص ہو کر غزل صدر مشاعرہ کی میز پر پھینک کر چلے آئے مجبوراً سکریٹری مشاعرہ نے وہ غزل شفاعت حسین بیخود یا جلیل قدوائی سے پڑھوا کر خانہ پری کر دی۔ مجھے اس صورتِ حال پر سخت افسوس تھا۔ دوسرے دن جب کمیٹی نے بہترین غزل کا انتخاب کیا تو اصغر کی یہی بہترین غزل قرار پائی اور اصغر کو طلائی تمغہ دیا گیا۔ نمونتہً غزل کے چند اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں ؎

نمایاں کر دیا اس نے بہارِ روئے خنداں کو
کہ دی نغمہ کو مستی رنگ کچھ صبحِ گلستاں کو

ذرا روکے ہوئے موجِ تبسم ہائے پنہاں کو
ابھی یہ لے اڑیں گی بجلیاں تارِ رگِ جاں کو

یہاں کچھ نخل پہ بکھرے ہوئے اوراق رنگیں ہیں
مگر اک مشتِ پر سے پوچھئے رازِ گلستاں کو

ہوئے جو ماجرے خلوت سرائے راز میں اس کی
نہ کفر اس سے ہوا واقف خبر اسکی نہ ایماں کو

نہ میں دیوانہ ہوں اصغرؔ نہ مجھ کو ذوقِ عریانی
کوئی کھینچے لئے جاتا ہے خود جیب و گریباں کو

بیگم اصغر سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی اور ان کو اولاد کی بڑی آرزو اور تمنا تھی بالآخر ان کے ذہن میں حصولِ اولاد کی یہ عجیب تدبیر آئی کہ وہ خود اصغر سے طلاق حاصل کر کے اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ ان کا عقد کر دیں۔ اور خود آخر دم تک اصغر کے ساتھ رہ کر ان کی خدمت گذاری بدستور کرتی رہیں۔ کیونکہ شرعاً دونوں بہنیں۔ ایک ساتھ ان کی زوجیت میں نہ رہ سکتی تھیں۔ چنانچہ وہ ایک عرصہ سے اصغر کو مجبور کر رہی تھیں کہ وہ

ان کے پلان کو منظور کر لیں۔ مگر اصغر کسی طرح اس بات پر رضامند نہیں تھے۔ قیام لاہور کے دوران ۱۹۲۷ء میں کہ اب عہد پیری میں داخلہ ہو چکا تھا۔ بیگم اصغر نے پھر بڑی شد و مد سے یہ مہم شروع کی۔ ان کو واقعی اولاد نہ ہونے کا بڑا غم تھا اور وہ اس غم میں گھلی جا رہی تھیں۔ بآخر اٹوائی کھٹوائی لے کر یا زمانۂ حال کی اصطلاح میں ستیہ گرہ شروع کر کے کھانا پینا ترک کر دیا۔ اصغر بڑے رفیق القلب انسان تھے۔ وہ اس حربہ کی تاب نہ لا سکے۔ مجبوراً انھوں نے بی بی کی ضد کے آگے سپر ڈال دی۔ جس کے نتیجہ میں انھیں شرعاً طلاق دے کر اپنی سالی نسیم یعنی مطلقہ بیگم جگر کو عقد میں لینا پڑا۔ مطلقہ بیگم اصغر اب بڑے سکون سے تادم آخر ان کے ساتھ رہ کر خدمت کرتی رہیں۔ ان کے اس عظیم ایثار و قربانی کے باوجود قدرت کو منظور نہ تھا کہ ان کی اولاد کی تمنا پوری ہو اور ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء کو الہ آباد میں اصغر کی وفات نے اس باب کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ابھی حال میں ۲۱ نومبر ۱۹۶۶ء کو ایک بار پھر گونڈہ کا سفر اختیار کیا کہ بیوۂ اصغر و جگر سے و نیز اپنے و اصغر کے قدیم ترین دوست کنور وشونا تھ صاحب ایڈوکیٹ گونڈہ سے مل کر حیات اصغر سے متعلق گفتگو کر کے اپنا حافظہ تازہ کر لوں۔ جیسا کہ بیشتر تحریر ہو چکا ہے۔ کنور صاحب کی عمر کا اب بفضلہ ۸۱واں سال چل رہا ہے۔ ان سے زیادہ معمر کوئی صاحب علم آج گونڈہ میں موجود نہیں۔ بیوۂ اصغر و جگر سے ملاقات پر معلوم ہوا کہ اسی مہینہ میں چند روز قبل دہلی کے کسی اخبار (غالباً ہندوستان ٹائمز) کے نمایندہ ان کے پاس گونڈہ آئے تھے اور اصغر و جگر کی حیات سے متعلق ان سے انٹرویو لیا تھا۔ وہ کچھ تصاویر بھی مکان وغیرہ کی لینے کو کہتے تھے، جسے شائد کسی صورت میں شائع کرنا مقصود ہے۔ جو کچھ انھوں نے پوچھا اس

کے جوابات لکھوا دیے گئے تھے۔ میں نے موصوفہ سے جو استفسارات محض اپنے حافظہ تازہ کرنے کی نظر سے کئے تو اس پر کہنے لگیں کہ "مجھ سے تو کہیں زیادہ خود آپ ہی واقف ہیں میں آپ کو کیا بتا سکتی ہوں۔" تاہم بعض اُمور کی میں نے احتیاطاً ان سے صحت و تصدیق کر لی۔ ۱۲ر نومبر کی شام کو میں کنور صاحب سے ملا۔ اور ان سے اصغر پر مضمون لکھنے کا ذکر کر کے اس کے کچھ حصّے پڑھ کر سُنائے جس پر کنور صاحب نے کہا کہ "بھائی رشید! تم نے جو کچھ لکھا ہے ٹھیک لکھا ہے مگر تم نے اس میں اصغر کی مے نوشی کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ جب تک ان کے عہد مے خواری کا ذکر نہ کیا جائے، میری دانست میں ان کا کوئی تذکرہ مکمل نہ ہو گا۔ اب تک اصغر پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں افراط و تفریط کے سوا توازن کم نظر آتا ہے یا تو ان لوگوں نے محض تقریظ لکھی ہے اور ان کی شخصیت اور فن دونوں کے محاسن کو مبالغہ سے پیش کیا ہے یا پھر کچھ لوگوں نے اپنی تنگ نظری اور تعصب سے ان کی جائز خوبیوں اور مراتب و مقام کے اعتراف میں بھی بخل و ناانصافی سے کام لیا ہے اور ان کی معمولی خامیوں اور فروگذاشتوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے میں اپنی بڑائی و ناموری سمجھی ہے۔ حق و انصاف اور وسط و اعتدال کا راستہ بہت کم لوگوں نے اختیار کیا ہے۔

خدا کی ذات کے سوا کسی بڑے سے بڑے انسان کی نسبت بھلا کب یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ وہ بے عیب ہے۔ اصغر کا کیا ذکر۔ کسی کو عیب لگانے سے پہلے انسان کو خود اپنی خامیوں پر نظر کر لینی چاہیئے۔ تم اصغر کے عہد مے خواری کا ذکر کر کے یہ بتاؤ کہ کس ماحول اور کن حالات میں ان سے یہ لغزش ہوئی۔ اور قطع نظر ان کے دیگر محاسن کے تم ان کی سیرت کے اس وصف کو اُجاگر کرو کہ اصغر کتنے بلند کردار اور اپنے عزم و حوصلہ میں کیسی پختگی اور استقامت رکھتے تھے کہ ایک بار جو عہد کر لیا اس پر آخر دَم تک قائم رہے۔ چنانچہ پانچ برس تک اس

گناہ میں مبتلا رہ کر انھوں نے جس روز ترک مے نوشی کا عہد کیا اور خدا سے توبہ و استغفار شروع کی، ساری زندگی خدا کے حضور اپنے قصور کے عجز و اعتراف میں بسر کر کے ہمہ تن پیکر شرم و ندامت بن کر گذار دی۔ ان کی اس خود شناسی نے خدا شناسی بن کر ان کو عام انسانی سطح سے کتنا ارفع بلند کر دیا۔ زندگی کا حق ادا کرنے میں سب سے پہلے خود آگہی لازم ہے۔ انسان خود اپنی زندگی کا کارساز ہے۔ زندگی میں توانائی خود اپنے زور بازو سے آتی ہے۔ انسان کا ظرف خود اس کی ہمت پر موقوف ہے اور دنیا سے وہ خود بقدر ظرف مستفید ہو سکتا ہے۔ جو لوگ اپنے کتابی علم کی میزان پر اصغر کے کلام کی خوبیوں اور خامیوں کو تولتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ اصغر نہ کسی بڑے جامعہ کی فارغ التحصیل عالم و فاضل تھے اور نہ انھوں نے کوئی علمی سند حاصل کی تھی، نہ کسی بڑے استاد کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا تھا۔ انھوں نے جو کچھ بھی علمی استعداد و بصیرت حاصل کی۔ وہ قدرت کی فیض بخشی اور خود ان کے ذاتی مطالعہ اور وسعت فکر و نظر کا نتیجہ تھی۔ ایسی صورت میں ان کی شاعری میں قواعد و عروض محاورہ و بندش اور اسلوب بیان وغیرہ کی گوناگوں خامیوں پر کسی کو حیرت و تعجب کیوں ہے؟ دوسروں کی نگاہ کا تنکا دیکھنے والے اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں دیکھتے۔

کنور صاحب کا دعویٰ ہے کہ بیسویں صدی میں گونڈہ کی سرزمین سے سوہن لال و اصغر دو جی نی اس (عبقری) پیدا ہوئے۔ جو ہم عمر ہونے کے سوا اپنی ابتدائی تعلیم کے دوران گورنمنٹ ہائی اسکول گونڈہ میں ہم جماعت بھی تھے۔ حالات نے مساعدت کی۔ سوہن لال نے امتیاز کے ساتھ انٹرنس پاس کرنے کے بعد کیننگ کالج لکھنؤ سے فرسٹ ڈویژن میں بی۔ اے اور اسی طرح الہ آباد یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا۔ اور بیلاری

یونیورسٹی میں اوّل یا دوم نمبر حاصل کیا۔ جس کے نتیجہ میں وہ الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوگئے جہاں سے انھوں نے ڈاکٹریٹ بھی کرلی۔ ان کی غیر معمولی ذہانت و استعداد علمی کے پیش نظر گورنمنٹ نے انھیں براہ راست ڈپٹی کلکٹر مقرر کردیا جس سے ترقی کرکے وہ بالآخر کلکٹر ہوگئے۔ اور ۳۲-۱۹۳۳ء میں وہ الہ آباد میں بحیثیت کلکٹر و حاکم ضلع تعینات تھے۔ اس زمانہ میں ہندوستانی کے لئے ایسے عہدہ جلیلہ پر پہونچنا کتنا اہم و دشوار تھا۔ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ برخلاف اس کے ان کے ساتھی اصغر حالات کی نامساعدت کا شکار ہوکر ہائی اسکول کے درجہ تک بھی نہ پہونچ سکے۔ اور بیس روپیہ ماہانہ پر ریلوے میں ٹائم کیپری کرنے پر مجبور ہوئے۔ تاہم یہ امر واقعہ ہے کہ قدرت نے اپنی فیض بخشی سے اصغر کے ذہن و دماغ کو جو بصیرت و توانائی اور جلا بخشی تھی وہ کتابی علم سے بے نیاز و بلند و بالا تھی۔ وقت اور حالات نے ساتھ دیا ہوتا تو اصغر اپنے دوست اور ساتھی سوہن لال سے کہیں زیادہ بلند مقام پر پہونچتے۔ یہ قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ ۳۲-۱۹۳۳ء میں جب ڈاکٹر سوہن لال سریواستوا الہ آباد میں دو ہزار روپیہ ماہوار کے تنخواہ دار کلکٹر اور حاکم ضلع تھے۔ ان کے دوست اور ہم جماعت اصغر ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد میں دو سو روپیہ ماہانہ پر رسالہ ہندوستانی ایڈیٹر۔ مگر جہاں تک فکر و نظر کا تعلق ہے۔ وہ کسی طرح ڈاکٹر سوہن لال سے کم صاحب نظر اور عالی دماغ نہ تھے۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ سوہن لال اصغر کو مثل اپنے بھائی کے عزیز رکھتے اور محبت کرتے تھے۔ راقم الحروف کو ڈاکٹر سوہن لال سے ملنے اور ان کے و اصغر کے تعلقات کے اندازہ کرنے کا ذاتی طور پر اتفاق ہوا ہے۔ انھوں نے جارج ٹاؤن الہ آباد میں اپنی ذاتی کوٹھی بنائی تھی۔

کنور صاحب سے اصغر کی ایسی مخلصانہ دوستی اور ان کے بچوں سے اصغر کو اتنا انس و پیار تھا کہ انڈین پریس الہ آباد سے تعلق کے دوران انھوں نے بچوں کے لئے جو درسی کتابیں لکھی تھیں، ان میں کنور صاحب ہی کے بچوں کے گھریلو ناموں سے سارے مکالمے تحریر کئے تھے اور اس بات کا ذکر خود اصغر نے ان سے (کنور صاحب سے) کیا تھا جب وہ اپنے بیٹے کرشن موہن (عرف للن) کی شادی میں شرکت کی دعوت دینے خود اصغر اور موہن لال کے پاس الہ آباد گئے تھے۔ اصغر نے کہا تھا کہ درسی کتابوں میں ان بچوں کے نام اور مکالمے ان کی محبت کی یاد کو ہمیشہ تازہ رکھیں گے۔

اصغر کی موضع شاہ پور والی مرحومہ بی بی کے بطن سے جو دو لڑکیاں پیدا ہوئی تھیں ان میں سے بڑی لڑکی کی شادی ۱۹۲۷ء کے لگ بھگ فیض آباد کے ڈاکٹر خادم حسین کے لڑکے محمد صدیق کے ساتھ ہو چکی تھی، جو انڈین پریس الہ آباد میں ملازم تھے۔ اور چھوٹی لڑکی کا عقد اغلباً پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ذریعہ علی گڑھ یونیورسٹی کے ایک طالب علم عبد الحیٔ عباسی ساکن ضلع ساگر صوبہ متوسط (متعلم ایم۔ اے۔ ایل۔ بی) کے ساتھ مارچ ۱۹۳۶ء میں اصغر کی حیات میں ہوگیا تھا۔ صرف رخصتی کی رسم باقی تھی۔ جو اصغر کے انتقال کے بعد ۱۹۳۶ء میں الہ آباد ہی سے انجام پائی۔

ہر چند کہ اصغر کا دَورِ مے نوشی میرے ورود گونڈہ سے قبل ۱۳-۱۹۱۲ء میں حسب بیان کنور وشو ناتھ صاحب ختم ہو چکا تھا، اور وہ اس سے تائب ہو کر ایک زاہد پاکباز کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور ان کی پاکیزگی اور طہارت نفس میں میں نے روز افزوں ترقی ہی ہوتے دیکھی تھی۔ تاہم اپنے طویل قیام گونڈہ کے دوران میرے کان میں اصغر کے مذکورہ بالا دَورِ نشاط کی کچھ بھنک ضرور پڑی تھی۔ قاضیٔ شہر کی حیثیت سے نہ سہی، کوتوال شہر کی

حیثیت سے ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ میں نے اسے گزرا ہوا افسانہ سمجھ کر لائق اعتبار نہ سمجھا، اور اس مضمون میں اولاً میں نے ان کے اس دورِ زندگی کا ذکر کرنا ناپسند کیا تھا۔ مگر کنور صاحب کے قول و ہدایت کے بموجب کہ سیرت نگار کا فرض ہے۔ وہ پوری دیانتداری سے زندگی کے روشن پہلوؤں کو پیش کرے تاکہ زندگی کی ارتقائی منزلوں کا سارا نقشہ سامنے آجائے، میں نے بادلِ ناخواستہ اپنے مضمون میں ضروری ترمیم کرکے ان کا تذکرہ شامل کیا ہے اور اپنے دوست کی ہدایت کی تعمیل کی ہے میرا فرض ہے کہ اسی ضمن میں اپنے کرم فرما جناب افتخار اعظمی (مرکز ادب جہانگیر آباد پیلس لکھنؤ) کی پیش کردہ روایت کا بھی ذکر کردوں۔ جس کا اعادہ انھوں نے مجھ سے تکرار کے ساتھ کیا ہے۔ افتخار صاحب راوی ہیں کہ جگر صاحب نے کئی بار ان سے فرمایا تھا کہ" اصغر صاحب نے کمال کردیا کہ وہ شراب بھی پیتے تھے اور افیون بھی کھاتے تھے اور یہ دونوں چیزیں یک لخت اس طرح ترک کردیں کہ پھر ان کو ہاتھ نہ لگایا۔" اعظمی صاحب نے کہا کہ جگر کے ایسے بیان کے ایک موقع پر ان کے میرٹھ کے دوست حکیم سیف صاحب بھی موجود تھے۔ یہ بھی کہ بعض احباب کی نظر میں اصغر کی شخصیت کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ وہ ہے جب وہ انحطاط و خرابات کے راستہ پر گامزن تھے، جس کی کچھ جھلک ان کے ابتدائی کلام میں بھی آگئی ہے۔ اور دوسرا حصہ وہ ہے جب انھوں نے جذبات میں پاکیزگی و ارتقاد پیدا کیا۔ مرزا احسان احمد نے نشاطِ روح کے دیباچہ میں کہا ہے کہ" اصغر صاحب نے اپنی ایک بیاض جلا دی اور کہا کہ یہ سب خذف ریزے تھے"۔ یہ اشعار غالباً وہی تھے جو عہد میخواری میں کہے گئے تھے مثلاً ؎

پھانسا ہے دل کو لعنت چشمِ سیاہ میں
کاجل کی کوٹھری میں نظر بند کر گئے

وغیرہ

ابھی حال میں ۱۱ - ۱۲ فروری کو میرے کرم فرما حضرت روش صدیقی سے، جو نہ صرف ایک بلند پایہ شاعر بلکہ ایک ثقہ اور نہایت پاکیزہ خیال انسان ہیں۔ کان پور میں ملاقات ہوئی۔ میں نے اپنا یہ مضمون بہ نظر اصلاح انھیں دکھایا۔ انھوں نے بھی اصغر کے اس دورِ زندگی کے صحت کے باب میں مجھے اطمینان دلاتے ہوئے فرمایا کہ اس بات کا اصغر کے اکثر احباب کو علم ہے اور جگر مرحوم نے خود ان سے بھی اس کا ذکر کیا تھا۔

جہاں تک اصغر کے حلقۂ احباب کا تعلق ہے، میرے علم میں گونڈہ سے باہر والوں میں سب سے پہلے ان کا تعلق قاضی محمد حامد حسرت ایڈیٹر اخبار قیصر ہند و پیغام فیض آباد سے ہوا۔ اس کے بعد ان کا رابطہ شبلی اکاڈمی، اعظم گڈھ کے ارباب سے ہوا۔ جس میں زیادہ خصوصیت ان کو مولانا اقبال احمد سہیل اور مرزا احسان احمد سے رہی۔ یہ دونوں حضرات بلند پایہ نقاد، شاعر و ادیب تھے۔ حضرت سہیل کی شخصیت دنیائے ادب میں بہت بلند قامت تھی۔ اصغر کے پہلے مجموعۂ کلام نشاطِ روح کی علمی ترتیب و تدوین میں ان حضرات کا اور شبلی اکاڈمی کے اکابر کا بڑا دخل تھا۔ یوں تو اصغر بڑے مشکل پسند تھے اور اپنے معمولی اشعار کو ہمیشہ خارج کر دیا کرتے تھے۔ تاہم یہ کہنا شائد غلط نہ ہو کہ اصغر کے کلام کو رطب و یابس سے پاک کرنے میں سہیل کا مشورہ بھی کسی حد تک شامل رہا۔

اصغر کا پہلا مجموعۂ کلام (نشاطِ روح) ان ہی حضرات کے زیر اہتمام اواخر ۱۹۵۲ء میں اعظم گڈھ سے شائع ہوا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اعلیٰ تنقیدی سطح پر سب سے پہلے اصغر کو دنیائے ادب سے روشناس کرانے والوں میں مولانا اقبال احمد سہیل اور مرزا احسان احمد ہیں 'نشاطِ روح' میں دونوں شخصیتوں کے تنقیدی مقالات نے دبستان لکھنؤ کے اکابر کو اصغر کی طرف متوجہ کیا بعض نے اعتراف کا پہلو اختیار کیا، اور بعض نے معاندانہ روش

اختیار کی۔ ان کے مخالفین میں نیاز داثر قابل ذکر تھے۔ ان کے اختلاف کی بحث و تجزیہ
کا یہ محل نہیں۔ میری بضاعت اور موضوع دونوں سے یہ باہر بھی ہے۔ اسی طرح کبیر احمد
جائسی کے نام سے ایک مضمون جو "نشاطِ روح اور سہیل" کے عنوان سے نگار ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون
میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اصغر کے کلام پر حضرت سہیل نے اصلاح دی ہے اور ان کے کمزور اشعار
کو قلم زد کر دیا ہے۔ دونوں دوستوں کے ذاتی تعلقات کے پیشِ نظر میری دانست میں یہ امر
نہ حضرت سہیل کے لئے موجب فخر و مباہات ہو سکتا ہے اور نہ اس سے اصغر کی عظمت و بلندی
میں کوئی فرق آتا ہے، البتہ مضمون نگار کے طرز فکر کا یہ ضرور غماز ہے۔ افسوس یہ کہ انکشاف
حضرت سہیل کی زندگی میں نہیں کیا گیا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بھی اس انتساب اور اسکے پس پشت
جو اسپرٹ کار فرما ہے اس سے خوش نہ ہوتے اور اسے شایان دوستی نہ سمجھتے۔ شاید اسی وجہ سے
کبیر احمد صاحب جائسی نے سہیل کی حیات میں اس مضمون کے لکھنے پر توجہ نہیں فرمائی۔

فیض آباد، اور عظم گڈھ کے احباب کے بعد بارہ بنکی، لکھنؤ، علی گڈھ اور الہ آباد
وغیرہ کے اکثر احباب سے اصغر کو خصوصیت تھی، جس میں علی گڈھ کے ایک بزرگ کو خاص
امتیاز حاصل تھا یوں تو اصغر ایسے محبّت کرنے والے بے ریا اور مخلص انسان تھے کہ جس
کسی سے بھی ملتے خلوص و محبّت سے ملتے اور ان کا ہر ملنے والا یہی سمجھتا کہ وہ اسے سب سے
زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کے احباب کی تفصیل بیان کرنا ممکن نہیں۔

اصغر نے مرتے وقت اپنی بیگم کو وصیت کی تھی کہ جگر مے نوشی ترک کر کے پاک زندگی
اختیار کر لیں، تو وہ پھر ان سے عقد مناکحت کر لیں، چنانچہ یہی ہوا کہ اصغر کی وفات
تھوڑے ہی دن بعد جگر کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم آیا۔ وہ مے نوشی ترک کر کے
سختی کے ساتھ پابند صوم و صلوٰۃ ہو گئے۔ اور اس طرح اصغر کی وصیت پر عمل کر کے انھوں

نے ۱۹۳۹ء میں خود اپنی ... قر بی بی (یعنی بیوہ اصغر) کو دوبارہ اپنے عقدِ مناکحت میں لیا۔ اور اب جگر کے انتقال کے بعد وہ بیوہ جگر کی حیثیت سے باقی و موجود ہیں۔ ان کی بڑی بہن، یعنی ... بیگم اصغر ... اپنے گھر میں جگر کے ساتھ زندگی بھر رہیں۔ ان پر بھی ۱۹۵۲ء میں ... کا حملہ ہوا ... سے وہ صاحبِ فراش ہو گئی تھیں۔ اور ماہ جون ۱۹۶۳ء میں گونڈہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اصغر کے سالے حاجی گلّن میاں بھی حج بیت اللہ سے مشرف ہو کر راہی ملک بقا ہوئے۔

الغرض علم و حکمت، زہد و ریاضت، خلق و ایثار اور محبت کا سراپا مجسمہ اصغر اپنی تابندگی کے کچھ لازوال نقوش چھوڑ کر اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گیا۔ اس نے اپنے نغمۂ سرودِ زندگی سے روحِ انسانی کو تازگی، توانائی اور جلا بخشی، اور اپنے ضمیر کی روشنی سے نہ صرف خود گناہ و خسران کے قعرِ ذلت سے نکل کر خیر و سلامتی کی راہ پر گامزن ہوا، بلکہ اس نے اپنے ایثار اور قوتِ ایمانی سے خدا کے چند گم کردہ راہ بندوں کی زندگیوں کو بھی سنوارا اور آراستہ کیا۔ ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک باطن را

اصغر کے چند خطوط (بنام رشید احمد) کے اقتباسات

۱۔ گونڈہ / ار جولائی ۱۹۲۳ء

السلام علیکم! یہ معافی کی طلب ہے یا استحصال بالجبر!! مجھے نہیں معلوم کہ استبداد و تحکم سے کبھی معافی طلب کی گئی ہو گی۔ ہو گی۔ مجھے ... تامل ... کہ آپ ... کی عجیب ... دنیا کی ... صحبتیں، وہاں کی خرید و فروخت، غرضکہ اس قسم کی باتیں خط میں ہوں گی، اس لئے کہ

خط ملفوف تھا، مگر اس میں صرف ایک بے کیف داستان کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ طفلانہ
ہار جیت اگر واقعی بہت ضروری ہے تو لیجئے میں لکھتا ہوں کہ "ہاں معاف ہے" اب
تو نینی تال کے ADVENTWRES شروع کیجئے۔ ایک مکان لینے کی تجویز ہو رہی ہے
یہ مکان چک منڈی کے قریب مسجد سے ملا ہوا ہے۔ آپ آئیے گا تو دیکھئے گا۔

والسّلام۔ احقر اصغر

۲۔ گونڈہ / ۱۲ر جولائی ۱۹۲۳ء

محبّی! السلام علیکم۔ اب تک آپ کے خط کا جواب نہیں لکھ سکا۔ ایک
طولانی کا جواب یقیناً طولانی ہی ہونا چاہیئے۔ اس خیال سے روح خشک ہو رہی
تھی۔ بارے آج خیال ہوا کہ بھئی خدا کا نام لے کر تم اپنا پوسٹ کارڈ تو نکالو۔ ورنہ
اسی امید و بیم اور اسی امروز و فردا میں جھولتے رہ جاؤ گے۔ مہربانی کر کے اس کم توفیقی
پر منھ نہ بنائیے گا۔ مجھ ایسے کاہل سے اتنا بھی مغتنمات سے ہے۔

نینی تال کی سینری اور آپ کی تفریحوں کے حالات معلوم ہوئے۔ امید ہے کہ
اب صحت پر کافی اثر پڑا ہو گا۔ دیکھئے وہاں سے واپسی کے بعد میں نہ کراہنے کی آواز
سنوں، اور نہ چہرے پر خستگی و اضمحلال دیکھوں۔۔۔

ہاں! میں نے سُنا ہے کہ نینی تال میں عمدہ و نفیس چھڑیوں کے علاوہ کوئی
مخصوص ایسی لکڑی بھی ملتی ہے جس کا خاصہ ہے کہ جس مکان میں ہو، اس میں سانپ
نہیں آتے، یہ کہاں تک صحیح ہے؟ اگر اس میں کچھ اصلیت ہو تو میرے لئے ضرور لائیے گا
اسلئے کہ میں سانپ سے بہت ڈرتا ہوں اور مجھے اپنی اس تاریک خیالی پر مطلق شرم نہیں

کہ میں اسے ایک آسیب ہی سمجھتا ہوں۔

ایک تازہ واقعہ جو میرے متعلق ہے اسے البتہ سُن لیجئے! وہ یہ کہ میں نے جس مکان کا تذکرہ آپ کو لکھا تھا، آج میں نے اسے خرید لیا ہے۔ اس وقت کہ یہ کارڈ آپ کو لکھ رہا ہوں، چودھری حامد حسین صاحب اُس کی رجسٹری کرانے کچہری گئے ہوئے ہیں۔ یہ مکان چک منڈی میں مسجد سے ملا ہوا، املی کے درخت تلے واقع ہے۔ ایک صاحب نیاز علی نامی تھے، جو یہاں محرّر رجسٹری تھے، اور اب ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ یہ مکان ان کا تھا۔ والسّلام

احقر اصغر

۳۔ الہ آباد ۱۱ر جولائی ۱۹۲۹ء

رشید صاحب! سلام مسنون

میں ۱۶ر جون کو گونڈہ گیا۔ معقولیت و انسانیت نہیں تھی تو کم از کم ضرورت تو تھی ہی کہ آپ سے ملتا۔ مگر نہ مل سکا۔ میں نے ضلعدار صاحب کا ایک خط جو میرے نام آیا تھا آپ کے ملاحظہ یا مطالعہ (جو سمجھئے) کے لئے بھیج دیا تھا۔ اس کی پشت پر یہ بھی لکھ دیا تھا کہ براہ کرم اس پر توجّہ فرمائیے۔ آج میاں گلّی پریشان و بدحواس الہ آباد پہونچے۔ ان سے معلوم ہوا کہ باوجود آپ کی ہدایات اور ارشاد کی تعمیل کے اب تک اس معاملہ کا کوئی انسداد نہ ہو سکا۔ دراں حالیکہ اگر آپ خفیف سی بھی اس پر توجہ فرمائیں تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ مجھے اس پر تعجب ہوا۔ حالانکہ اس عجائب رازِ عالم میں کیا چیز ممکن نہیں۔ تعجب کا کیا محل ہے؟ اسی کے ساتھ آپ کی سلامت روی، تجربہ کاری اور

نستعلیق احتیاط کی جانب خیال گیا تو پھر تعجب بالکل جاتا رہا۔ لیکن .....

بہر حال میں تو یہ قصّہ سنتے سنتے ایک بار سخت جھنجھلا اٹھا۔ اور جو کچھ بُرا بھلا ان کو کہہ سکتا تھا کہہ سُن دیا۔ انھوں نے چاہا کہ میں گونڈہ میں پھر کسی کو لکھوں پڑھوں میں اس پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ تم یہ سمجھ لو کہ میرے تمام ملنے والوں کا گونڈہ میں خاتمہ ہو گیا۔ یہ نہیں تو یوں سمجھو کہ میرے ملنے والوں کے نزدیک میرا خاتمہ ہو گیا۔ تم اب گھر جا کر اطمینان سے بیٹھو۔ اگر یہ سب آج نہیں ہوا ہے تو کل ہو کر رہے گا۔ خدا زندہ ہے اور وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اگلے پچھلے قصّوں کو تو جانے دو، میرے دیکھتے دیکھتے دنیا میں عجیب سے عجیب واقعات ہو چکے ہیں بڑی بڑی مشکلیں لوگوں پر سے ہٹ گئی ہیں۔ اور بڑے بڑے ظالموں کو اس نے توڑ کر رکھ دیا ہے۔ اور یہ بھی نہ سہی تو بہر حال جب ایک دن مرجانا ہے تو چھوٹے چھوٹے دنیاوی مصائب کی ان کے سامنے حقیقت ہی کیا ہے۔ مگر میاں گلّی کے ساتھ اور لوگ بھی سفارش و ہمنوائی کے لئے موجود ہیں۔ اس لئے مجبوراً آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔ لیکن میں نے کہہ دیا ہے کہ نیٹیو را نداز کا بار بار تقاضا میرے امکان سے باہر ہے۔ یہ اس موضوع و بحث پر میری آخری تحریر ہے۔ آئندہ کبھی اس بحث کو چھیڑنے کی حماقت نہ کروں گا۔

والسّلام

احقر اصغر

۴۔ ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد ۲۱ر اپریل ۱۹۳۱ء

رشید صاحب! السلام علیکم

ایک ضرورت ہے:

اکیڈمی کے کچھ لوگوں نے بندوق کے لائسنس کے لئے درخواستیں دیدیں۔ مجھ سے بھی کہا گیا کہ ؏

اک نالہ تو بھی پیشکشِ صبحگاہ کو

چنانچہ میری بھی درخواست گذر گئی۔ اب اس سلسلہ میں ممکن ہے کہ گونڈہ سے بھی میرے لئے کچھ تحقیقات کی جائے ..... اس کے بعد آپ ہی کو بندوق کا بھی انتظام کرنا ہوگا۔ بقر عید انشاء اللہ گونڈہ ہی میں ہوگی۔ زبانی بہت سی باتیں کرنے کی ہیں....

والسلام احقر اصغر

۵۔ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد۔ مئی ۱۹۳۶ء

بہت دنوں سے آپ کا کچھ حال نہیں معلوم ہوا۔ امید ہے بخیریت ہوں گے۔ میرا بلڈ پریشر ابھی تک زیادہ بتایا جا رہا ہے۔ علاج ہو رہا ہے۔ لیکن بظاہر عام صحت خاصی معلوم ہوتی ہے۔ ایک مطلع سنیئے ؎

کچھ اس انداز سے موجِ نسیم مشک بار آئی
کہ اپنے پیرہن سے آج مجھ کو بوئے یار آئی

احقر اصغر

۶۔ ہندوستانی اکیڈمی۔ الہ آباد ۳ر نومبر ۱۹۳۶ء

(انتقال سے صرف چند دن پہلے)

مکرم! سلام مسنون

عنایت نامہ معہ دعوتی رقعہ کے موصول ہوا، جس کا شکر گزار ہوں۔

آپ نے سنا ہوگا کہ میں دسہرہ کی تعطیلوں میں گونڈہ چلا گیا تھا۔ جس کا خمیازہ اب تک اُٹھا رہا ہوں۔ وہاں بلڈ پریشر بہت بڑھ گیا۔ علاج ہو رہا ہے۔ اتفاق سے اسی تاریخ کو برتا بگڑھ ہائی اسکول میں مشاعرہ تھا۔ کچھ لوگ آئے تھے اور مجھے اس کی صدارت پیش کر رہے تھے۔ یہاں میرا حال دیکھ کر مجبوراً واپس چلے گئے۔
میں اگر کسی طرح آ سکتا تو بڑی خوشی سے اس تقریب میں شامل ہوتا۔ بہر صورت فی الحال میں سوا مبارک باد کے اور کیا عرض کر سکتا ہوں۔ امید ہے کہ معاف فرمائیے گا۔

احقر اصغر

۷۔ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ۱ر مئی ۱۹۳۶ء

مکرم اسلام مسنون۔

میاں سعید آپ کا دستی گرامی نامہ لے کر آئے تھے۔ میں نے جو حالت تھی ان سے کہہ دی تھی۔ تاہم احتیاطاً یہ کارڈ بھی لکھ رہا ہوں ..... میری طبیعت بحمد اللہ اب اچھی ہے۔ آج کل کام بہت زیادہ ہے۔ عدیم الفرصت ہوں۔ اس وجہ سے یہ کارڈ بھی دیر کر کے لکھ رہا ہوں۔ امید ہے معاف فرمائیے گا۔

احقر اصغر

۸۔ گونڈہ ۲۰ر دسمبر ۱۹۳۶ء

مہربان من سلامت! آداب خادمانہ قبول فرمائیے۔ آنجناب کا خط عین انتظار میں موصول ہو کر کاشف حالات ہوا۔ اب تو اصغر با بو گزر ہی گئے۔ اب آپ

لوگوں کا سہارا ہے۔ بابو کی ایک لڑکی کی شادی کرنا ہے۔ اللہ مالک ہے۔ ہمشیرہ وغیرہ کو ان کے ملنے والے نہیں آنے دے رہے ہیں۔ ہمارے بھائی و نیز ہمارے بچے بھی اس وقت وہیں پر ہیں۔ بقیہ سب خیریت ہے۔

حاجی گلی۔ گونڈہ

(اصغر مرحوم کے سالے)

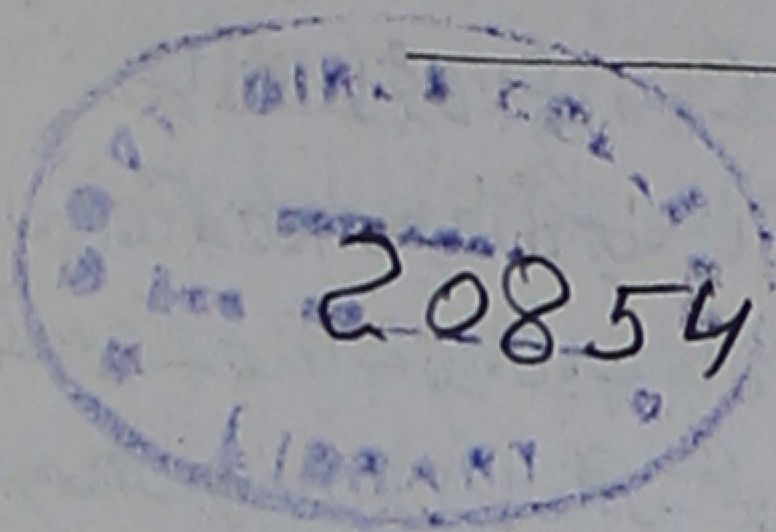
۹۔ الہ آباد ۲۳ر جولائی ۱۹۳۷ء

جناب رشید صاحب! السلام علیکم

اصغر مرحوم کے انتقال کے بعد چونکہ نورِ چشمی ننھی سلمہا (مرحوم کی صاحبزادی) کی شادی کے لئے یہ تجویز ہوئی کہ الہ آباد ہی سے کی جائے۔ اور الہ آباد کے قیام کے لئے ضرورت تھی کہ کوئی اپنا عزیز مرد بھی ساتھ رہے۔ اور میں ملازمت سے سبکدوش ہو چکا تھا۔ لہٰذا میں مرحوم کے متعلقین کے ساتھ الہ آباد میں ہوں۔ سب لوگ گونڈہ میں رہ کر ۱۶ر جولائی کو الہ آباد آئے ہوئے ہیں۔ عقدِ نکاح سادہ طور پر مارچ میں ہو گیا تھا۔ مرحوم کی حیات میں۔ کھورئی ضلع ساگر میں نسبت ٹھہری تھی۔ عبدالحئی عباسی جن کے ساتھ عقد ہوا ہے علی گڑھ میں پڑھتے ہیں۔ امسال ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان دیا ہے۔ ان کے نام تین موضع زمینداری کے ہیں۔ رخصتی آخر جولائی یا شروع اگست میں ہوگی۔ اور ہم لوگ اسی ضرورت سے الہ آباد آئے ہوئے ہیں وہاں سے تعین تاریخ کی ابھی کوئی اطلاع نہیں آئی ہے جس کا انتظار ہے۔ مرحوم کے انتقال کے بعد معلوم ہوا ہے کہ آپ کے دو تین خط گونڈہ آئے۔ لیکن چونکہ ہم سب لوگ یہاں

تھے۔ خط نہیں ملے۔ صرف ان کی آمد کی اطلاع ملی۔ اور پتہ نہ معلوم ہونے کی وجہ سے
آپ کو خط نہیں لکھا جا سکا۔ تاریخ مقرر ہونے پر آپ کو پھر اطلاع دی جائے گی۔
ان خصوصی تعلقات کی بنا پر جو آپ کو مرحوم کے ساتھ تھے آپ کو یہ بتانے کی ضرورت
نہیں کہ مرحوم کی حیات میں شائد کسی وجہ سے آپ شریک نہ ہو سکے۔ لیکن اب آپ
کی ذمہ داری بہت اہم ہو گئی ہے۔ اور اس موقع پر ضرور بضرور شریک ہو کر
ہم لوگوں کا ہاتھ بٹائیے۔ نور چشمی ننھی سلمہا اور اہلیہ اصغر صاحب سب کو دعا
وسلام کہتی ہیں۔

نیاز مند (چودھری) حامد حسین از الہ آباد
بلویڈر ہاؤس۔ مکان اصغر مرحوم
(اصغر صاحب کے عزیز)



اصغر گونڈوی

رشید احمد صدیقی

انداز ہیں جذب اس میں سب شمع شبستاں کے
اک حسن کی دنیا ہے خاکستر پروانہ

(اصغر گونڈوی)

دنیا کی بھلی یا بری باتیں دنیا کے بھلے یا برے لوگوں سے ثابت ہوتی ہوں یا نہیں سمجھ میں اسی طرح آتی ہیں۔ ماں باپ، بھائی بہن، احباب سب کی محبت میری سمجھ میں تو اپنے ہی ماں باپ بھائی بہن اور دوستوں کی محبت سے آئی۔ اصغر صاحب مرحوم میں جو خوبیاں تھیں۔ ممکن ہی نہیں یقین ہے دوسروں میں بھی ہوں گی لیکن مجھے وہ خوبیاں اس لئے زیادہ عزیز ہیں کہ وہ اصغر صاحب کی خوبیاں تھیں جن کی ذات نے اُن کو عزیز تر وگرامی بنا دیا تھا۔

مرحوم سے پہلی ملاقات ۱۹۲۵ء کے جاڑوں میں مدرسۃ العلوم بچاس سالہ جوبلی کے موقع پر علی گڈھ میں ہوئی۔ عجیب اتفاق ہے کہ مولانا اقبال احمد سہیل ایم اے ال بی (علیگ)

ہی کے توسل سے ہوئی جنھوں نے ذاکر صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۱۵ء میں کرائی تھی
اُس وقت میں اصغرؔ صاحب کی ذات یا کلام دونوں سے ناآشنا تھا۔ مولانا سے البتہ
پُرانی یاد اللہ تھی۔ رات کے آٹھ بجے تھے۔ مولانا اور اصغرؔ صاحب ساتھ ہی مکان پر
تشریف لائے۔ میں گھر میں تھا سہیلؔ صاحب کی اطلاع ہوئی تو بے اختیار باہر آیا
اور بہت سے غیر ذمّہ دارانہ فقرے کچھ ادھورے کچھ پورے ورد زبان کرتا آیا اِس لئے
کہ میں نے سہیلؔ[1] صاحب جیسا بے پناہ برجستہ گو اور دقیقہ سنج اَب تک نہیں دیکھا تھا۔
وہ عالمانہ نکتوں اور مجلسی فقروں کو اِس لطف کے ساتھ ایک دوسرے میں سموتے ہوئے
برمحل و مسلسل چست کرتے چلے جاتے ہیں کہ طبیعت عش عش کرجاتی ہے۔ کچھ کہنے والا ہی
تھا کہ ایک صاحب نظر آئے کمرہ چھوٹا تھا دروازے بند روشنی مدھم کچھ ایسا محسوس
ہوا جیسے اجنبی کے قد و قامت کے مقابلہ میں کمرہ کی وسعتیں لحظہ بہ لحظہ سمٹی جارہی ہیں۔
دراز قد بھرا بھرا جسم ستھری و خوش قطع پوشاک سر پر پیٹے سڈول فرینچ کٹ ڈاڑھی
اونچی ٹوپی چہرہ پر اُجالا، آنکھوں میں خلوص کی گہرائی اور ذہانت کی شگفتگی، تیور
میں شرافت متوسط عمر انداز میں خود اعتمادی و دل آسانی۔ دل نے گواہی دی کہ
اچھے آدمی سے ملاقات ہوئی۔ یہ اصغرؔ صاحب مرحوم تھے۔

اصغرؔ صاحب کسی قدر جھکے ہوئے تھے جھکنا ایسا تھا جیسے کوئی بڑا آدمی بُرائی
اور بھلمنساہت سے جُھک گیا ہو۔ یہ جُھکا اعضا کا نہیں انداز کا تھا مسکرانا ایسا جیسا
کسی واقعہ پر نہیں مسکرا رہے ہیں بلکہ تبسّم اُن کی شخصیت کا جزو تھا اُن کے چہرے کی

---

[1] آج جبکہ ان سطور پر نظر ثانی کر رہا ہوں مولانا ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکے ہیں جب سے اب تک کیسے کیسے
دوستوں اور عزیزوں کو مرحوم کہنا پڑا ہے۔ اس محرومی سے اللہ بچائے یا نجات دلائے!

فضا ہی ایک مستقل شگفتگی تھی۔ مولانا سہیل سے میں بے تکلف ہی نہیں گستاخ بھی تھا۔
بولے لو ایک انسان لایا ہوں کہا شکر ہے آپ نے محسوس تو کیا کہ آپ کے ساتھ کسی
انسان کا وقتاً فوقتاً رہنا بہت ضروری ہے۔ بولے لو، لو اصغر صاحب ہیں۔
اصغر صاحب مسکرا کر آگے بڑھے اور بغلگیر ہو گئے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے محبت اور
مرحمت کے لمس نے مجھے کشش ثقل آزاد کر دیا ہو۔

مولانا سہیل نے اتنی فرصت غنیمت سمجھی اور اپنے بندھے ہوئے بستر پر بیٹھ گئے
پاس ہی لوٹا تھا اُسے اس طور پر اُٹھا لیا جیسے اُسے بیچنے والے تھے۔ مجھے اصغر صاحب
کے بکس پر بیٹھنے کو کہا اور ابھی بیٹھنے کیا سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ بولے سنو اصغر صاحب
کا ایک شعر سناتا ہوں۔ ابھی شعر کی باری نہیں آئی تھی بولے اصغر صاحب بس کسر یہ
رہ گئی کہ ذاکر نہیں ہیں ورنہ دیکھتے کیا لطف آتا پھر ایک خاص ترنم سے جیتے دروں
کے نہیں بلکہ بھلے مانسوں کے ترنم میں پڑھا ؎

رند جو ظرف اُٹھائے وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لے وہی میخانہ بنے

سہیل شعر کے بڑے پارکھ ہیں۔ ذاکر صاحب اچھے شعر سن کر نئی اور اچھوتی دنیائیں بنا دینے
میں کمال رکھتے ہیں۔ میں کسی میں نہیں لیکن اچھا شعر مجھ پر کچھ ایسا ہی اثر کرتا ہے جیسے
اچھا کام کرنے سے خوشی ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتا کہ مجھ پر
شعر کا کیا اثر ہوتا ہے یہ جو میں نے عرض کیا وہ محض مثال کے طور پر ہے۔ اور مثال پر
مجھے بھروسہ نہیں۔ دنیا میں سارا جھگڑا اس مثال کا سہارا لینے سے پیدا ہوا ہے۔
عرض کیا شعر بڑے مزے کا ہے اسے بکس و بستر پر بیٹھ کر اور لوٹا ہاتھ میں لے کر

غارت نہ کیجئے۔ سب لوگ اطمینان سے بیٹھے، کھانا آیا مولانا نے فرمایا اصغر صاحب ذرا روحِ نشاط تو نکالئے ان کو اشعار سنائیے عرض کیا مولانا جاڑا پڑ رہا ہے، انگیٹھی آتی ہے کھانا کھا کر جائے کا دور ہوگا۔ پھر جھوٹ سچ ملایا جائے گا۔ آپ تو اشعار کا بیوپار کرتے ہیں اس سے اصغر صاحب کی دنیا اور میری عاقبت خراب ہوتی ہے۔ آپ کا کیا نہ دنیا کے قابل نہ عقبیٰ کا ڈر ایک خاص انداز سے منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسے دونوں پاؤں گھٹنوں سے موڑ کر کرسی پر بیٹھے ہی بیٹھے جھولا سا جھولنے لگے۔ یہ مولانا کے "ابتہاج و اہتزاز" کی خاص علامت ہے۔

ناظرین معاف فرمائیں۔ ابتہاج و اہتزاز ایسے الفاظ استعمال کرنے میں کبھی اور ضرور تامل ہوتا لیکن جب بھلے مانس اور سمجھدار موجود ہوں تو الفاظ کے برمحل و بے تکلف استعمال کرنے میں ذوق کی تسکین ہوتی ہے۔ جاہلوں اور لیڈروں کے اس دور میں دقیق یا نازک مفہوم کو موزوں اور مکمل الفاظ سے ادا کرنے کو ترس گیا البھوتی کو کون سمجھائے کہ صاحبِ ذوق عربی فارسی یا کسی اور زبان کے الفاظ قابلیت کی نمائش یا تعصب کی بنا پر نہیں کرتے بلکہ مافی الضمیر کو فتح کرنے کے لئے کرتے ہیں عوام یا لیڈر کی سمجھ میں وہ لفظ نہ آئے تو وہ نہ جانیں۔ میں کب چاہتا ہوں کہ وہ جاہل بھی ہوں اور جواہر پاروں سے کھیلنے بھی دیے جائیں۔ عوام کو خوش کرنا ثواب کی بات ضرور ہے لیکن کبھی تو ایسا ہو جب اپنا اور اپنوں کا جی اپنے طور پر خوش کر سکیں۔

سب لوگ اطمینان سے بیٹھے ایسے موقع پر اطمینان سے بیٹھنے کے معنی اپنے اپنے بستر پر لحاف اوڑھ کر لیٹ جانے اور جس کے جی میں جو آئے کہہ گذرنے کے ہیں، نہ قوم کے تباہ ہونے کی پروا نہ زندگی کے فانی ہونے کا غم۔ آواز دی اندر سے پان آ گئے۔ انگیٹھی سرد

ہونے لگی ملازم نے اور کوئلے لاکر ڈال دیے نہ اندر سے بلائے جانے کا خدشہ، نہ باہر سے کسی صاحب کے آنے کا خطرہ۔ نیند آئی سو گئے۔ جی چاہا سو گئے جی چاہا بستر ہی پر مولانا نے فرمایا اچھا اصغر صاحب روحِ نشاط تو نکالیئے۔ مرحوم نے کہا اسکی ضرورت کیا ہے۔ آپ کو تو یونہی سب کچھ حفظ ہے میں نے کہا ذرا ٹھہریے۔ ابھی پہلا ہی شعر حلق سے نیچے نہیں اُترا ہے۔ مولانا نے نہایت متانت سے فرمایا جلدی کیجئے ورنہ پھندہ لگنے کا اندیشہ ہے۔ عرض کیا آلاتِ ظرف تو اُٹھالیا لیکن ابھی ساغر پینا باقی ہے۔ اور بعد پینے اور میخانہ بننے کا سوال آئے گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اصغر صاحب نے جو یہ شعر کہا ہے۔ اُسے وہ ہماری دُنیا میں آباد بھی کر سکتے ہیں کہ نہیں۔ متاعِ کنعاں مسلّم لیکن دام تو مصر ہی کے بازار میں لگیں گے دیکھنا یہ ہے کہ جہاں میرے آپ جیسے ناگفتنی موجود ہوں وہاں اصغر صاحب ساغر و میخانہ کی فضا بھی پیدا کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اصغر صاحب ہنس پڑے، کہنے لگے، شاعر تو شرافت و شہامت کا اعلان کرتا ہے مسجد میخانہ کی کیا کمی، کمی تو رندوں کی ہے۔ عرض کیا صحیح فرمایا، لیکن یہ تو بتائیے سہیل صاحب کے بارے میں کیا رائے ہے۔ کہنے لگے ان کی نہ پوچھیے تمام عمر میخانے میں نکلے تو محتسب بن گئے۔ میں نے کہا محتسب ہی نہیں گواہ سرکاری بھی۔ علی گڈھ سے باہر ان کا یہ حشر ہوا، نکالے گئے ہوتے تو یقیناً رند ہوتے۔

دوسرے دن اصغر صاحب نے نشاطِ رُوح کا ایک نسخہ بڑی محبت سے دیا کئی دن بعد مرحوم نے پوچھا آپ نے کتاب کا مطالعہ بھی کیا، عرض کیا اصغر صاحب اس وقت مولانا سہیل موجود نہیں ہیں۔ آپ خود کچھ متفرق اشعار سنائیے۔ یہ شخص بلائے بے درماں ہے۔ شعر سے لطف اٹھانے نہیں دیتا۔ سوچنے کے چکر میں ڈال دیتا ہے۔ وہ دیکھیے احاطے کے پھاٹک پر کسی بزرگ شخص سے اُلجھا ہوا ہے۔ یقیناً اُس سے وہ باتیں کر رہا

ہوگا جو افلاطون و ارسطو سے کرنی چاہیئے تھیں۔ اصغر صاحب نے فرمایا متفرق اشعار نہ سُناؤں گا پوری غزل سنیئے۔ شاعر کو اسی طرح سننا چاہیئے۔ تصوّر سے ہمکنار ہو گئے تصویر دیکھ کر کیا کیجیئے گا۔ پھر یہ غزل سُنائی، کیسا نرم پر تمکین و گوارا لہجہ تھا ؎

گلوں کی جلوہ گری مہر و مہ کی بوالعجبی
تمام شعبدہ ہائے طلسم بے سببی

گذر گئی ترے مستوں پہ وہ بھی تیرہ شبی
نہ کہکشاں نہ ثریّا نہ خوشۂ عنبی

یہ زندگی ہے یہی اصل علم و حکمت ہے
جمال دوست و شبِ ماہ و بادۂ عنبی

فروغِ حسن سے تیرے چمک گئی ہر شے
ادائے رسم جلالی و طرزِ بولہبی

سرشتِ عشق طلب اور حسن بے پایاں
حصولِ تشنہ لبی ہے شدید تشنہ لبی

وہیں سے عشق نے بھی شورشیں اڑائی ہیں
جہاں سے تو نے لیا خندہ ہائے زیر لبی

کشش نہ جام نگاریں کی پوچھ اے ساقی
چھلک رہا ہے مرا آب و رنگِ تشنہ لبی

دس گیارہ سال ہوئے کہ ایسا بیمار پڑا کہ زندگی کی اُمید نہ رہی لکھنؤ میڈیکل ہسپتال میں مدّتوں صاحب فراش رہا۔ اس زمانے میں اصغر صاحب الہ آباد میں تھے تقریباً ہر اتوار کو ہسپتال کے بالاخانے پر اپنے کمرہ کے قریب ٹھیک نو بجے دن کو پاؤں کی ایک خاص آہٹ سنتا۔ دروازہ کھلتا اصغر صاحب آہستہ آہستہ لیکن مستقل اور ہموار قدموں سے کمرہ میں مسکراتے ہوئے داخل ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ کچھ دیکھ کر یا محسوس کر کے خوش خبری سُنا رہے ہیں، کرسی پر بیٹھ جاتے۔ مجھ سے تو کیا کسی اور سے بھی نہ پوچھتے کہ کیسا ہوں یا کیا ہو رہا ہے۔ بات اس انداز سے کرتے جیسے مجھے دیکھنے کے لئے کوئی لمبا سفر کر کے نہیں آئے تھے بلکہ ہسپتال تک ٹہلنے کے لئے آئے تھے۔ میری طرف بھی آنکلے

باتیں ایسی چھیڑتے جن کا تعلق دُور دُور تک بھی مرض یا ہسپتال سے نہ ہوتا۔

اسی زمانے میں میرا ایک مضمون شیطان کی آنت شائع ہوا تھا۔ پوچھا اصغر صاحب یہ آپ ہر ہفتے الہ آباد سے یہاں کیوں آتے ہیں اور زحمت و زیر باری اٹھاتے ہیں۔ کچھ سوچا پھر مسکرا کر بولے۔ شیطان کی آنت کھینچ لاتی ہے۔ میں نے کہا فرشتوں کو بھی! فرمایا فرشتہ کو شیطان ہو جاتے بھی تو آپ نے سنا ہوگا۔ عرض کیا تکلیف نہ ہو تو کچھ سنائیے۔ اصغر صاحب میری اس (غالباً غیر متوقع) فرمائش پر بہت مسرور ہوئے اور یہ غزل بڑے لطف سے سنائی ؎

سرگرمِ تجلّی ہو اے جلوۂ جانانہ — اُڑ جائے دھواں بن کر کعبہ ہو یا بُت خانہ

یہ دین وہ دنیا ہے یہ کعبہ وہ بُت خانہ — اک اور قدم بڑھ کر اے ہمتِ مردانہ

قربان ترے میکش ہاں اے نگہِ ساقی — تو صورتِ مستی ہے تو معنیٔ مے خانہ

اب تک نہیں دیکھا ہے کیا اس رُخِ خنداں کو — اک تارِ شعاعی سے اُلجھا ہے جو پروانہ

مانا کہ بہت کچھ ہے یہ گرمیٔ حسنِ شمع — اس سے بھی زیادہ ہے سوزِ غمِ پروانہ

زاہد کو تعجب ہے صوفی کو تحیر ہے — صد رشکِ طریقت ہے یہ لغزشِ مستانہ

اک قطرۂ شبنم پر خورشید ہے عکس آرا — یہ نیستی و ہستی افسانہ ہے افسانہ

انداز ہیں جذب اس میں سب شمعِ شبستاں کے — اک حسن کی دُنیا ہے خاکسترِ پروانہ

گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کر واپس جاتے وہ بھی اس طرح جیسے رخصت نہیں ہو رہے بلکہ یوں ہی باہر جا رہے ہیں۔ صحت یاب ہو کر واپس آ گیا تو ایک عرصہ کے بعد معلوم نہیں کس سلسلہ میں پوچھا کیوں اصغر صاحب آپ ہسپتال میں مجھے دیکھنے آتے تو آپ پر ایک شگفتگی کیوں طاری رہتی، میں نے آپ کو اخلاقاً بھی کبھی فکرمند نہ پایا، کیا

میری ہمت افزائی مقصود تھی۔ بولے بالکل نہیں، اچھا سنیئے ایک لطیفہ سناتا ہوں:۔

ایک دن ہندوستانی اکیڈمی سے مکان واپس آرہا تھا...... صاحب راستے میں ملے اور نہایت غمناک لہجہ میں بولے اصغر صاحب بڑے افسوس کی بات ہے رشید صاحب کا انتقال ہوگیا، ایسے تھے، ویسے تھے۔ میں سن کر ہنس پڑا اور بولا حضرت حواس کی باتیں کیجئے انتقال کرنا کیسا۔ میں جانتا ہوں وہ زندہ ہیں اور تندرست ہو کر رہیں گے۔ انھوں نے مجھے بدحواس یا بے وقوف سمجھا اور لگے اپنی خبر کے موثق ذرائع بتانے گنانے میں نے کہا یہ سب صحیح لیکن میں ہر ہفتے دیکھ آتا ہوں، ان کی پیشانی پر نہایت جلی نقوش میں حیات لکھی ہوئی ہے، وہ نہ مانے، میں نے کہا آپ نہیں مانتے تو آئیے تار دے کر دریافت کرلیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور خبر غلط نکلی واقعہ یہ ہے کہ جب لکھنؤ پہونچ کر آپ کو دیکھتا تو فوراً یہ نظر آتا کہ زندگی اپنی پوری تابش و تازگی کے ساتھ موجود ہے، اور میں مسرور و مطمئن ہوجاتا۔

دس بارہ سال تک اصغر مرحوم کا ساتھ رہا۔ اُنھیں میں نے ہر حال میں دیکھا، اور ہمیشہ اصغر صاحب ہی پایا، یہ محض اتفاق تھا کہ وہ شاعر بھی تھے، شاعر نہ ہوتے جب بھی اُن کی شرف یا شہرت میں فرق نہ آتا۔ وہ جس موقع یا ماحول میں ہوتے ممتاز و محبوب رہتے، وہ کچھ عالم متبحر نہ تھے لیکن اُردو کے بہت سے شعراء سے کہیں زیادہ ذی استعداد و ذی علم تھے، بڑی رسا طبیعت تھی۔ نئے سے نئے اور پیچیدہ علمی مسائل کی تہہ تک اس سہولت اور صفائی سے پہونچ جاتے کہ کسی کو شبہ بھی نہ ہوتا کہ اس مرحلہ سے ان کا یہ سابقہ پہلی بار پڑا تھا۔ انگریزی کی خواندگی کچھ زیادہ نہ تھی اور نہ فن تنقید کے جدید اصولوں سے

آشنا تھے لیکن ہندوستانی اکیڈمی کے مشیر ادبی کی حیثیت سے ان امور سے سابقہ پڑا تو ان کے قلم سے نہایت متوازن، مستند و بے لوث تنقیدیں نکلیں اور ترجمہ توایسا کرتے کہ اکثر اصل کا دھوکا ہوتا، پکّے مسلمان اور مشرقی تھے۔ میں نے بڑے بڑے مغرب مآبوں کو اصغر صاحب کی بصیرت اور ہمہ جہت شخصیت کا معترف پایا، اُردو میں عام نثر نگاروں کے برخلاف وہ اپنی تحریریں زور، رنگینی اور وزن پیدا کرنے کے لئے حشو و زوائد سے کام نہیں لیتے تھے۔ اُردو کے بعض مستند اہلِ قلم بھی الف لیلیٰ کے یکبارہ سے ملتے جلتے ہیں۔ بات اتنی معمولی ہوگی کہ اُسے نہ بھی کہیں تو ہرج نہیں۔ لکھیں اس طرح جیسے دواؤں کا اشتہار لکھ رہے ہیں۔ ہندو مارے ڈالتا ہے۔ یا محبوبہ بھاگ گئی ہے، مرحوم تحریر و تقریر دونوں میں حفظ مراتب ملحوظ رکھتے۔ انڈین پریس الہ آباد کی فرمائش پر اُنھوں نے "تحفوں" کا ایک سلسلہ بچوں کے لئے تصنیف کیا جس میں مختلف ممالک کے حالات سے بچوں کو بڑے دل نشیں انداز سے روشناس کرایا ہے کچھ دنوں لاہور کے ادبی مرکز میں علمی خدمات انجام دیں۔ منتخبات کے بعض سلسلے اصغر صاحب ہی کے مرتب کئے ہوئے ہیں اور بڑے مستند اور رفیع سمجھے جاتے ہیں۔

مرحوم نے ایک مستقل تصنیف "اُردو کی ذہنی تاریخ" شروع کی تھی، کئی سو صفحات کا مسودہ ان کے کاغذات میں اب تک موجود ہے لیکن اوراق اتنے بوسیدہ اور گڈ مڈ ہو گئے ہیں اور حواشی اس کثرت سے لکھے ہیں کہ ان کا مرتب کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

آمدنی بہت کم تھی، لیکن کبھی تنگ دستی کا شاکی نہ پایا۔ اعلا خرچ تھا۔ اچھا پہنتے تھے، اُس سے اچھا کھاتے تھے، اپنی حیثیت سے زیادہ مدارات کرتے تھے

اُن سے دس گنی آمدنی والوں کو بھی میں نے اُن جیسا رکھ رکھاؤ رکھنے والا نہیں پایا
اُن کے جسم پر یا گھر میں کوئی چیز ایسی نہیں دیکھی گئی جس سے شبہ بھی ہو سکتا کہ
محض شوق پورا کرنے کی خاطر دوسرے یا تیسرے درجے کے بدل پر اکتفا کیا ہے اُن
کی ہر چیز میں ذوق و سلیقہ کی شہادت ملتی تھی، آج تک میلے اور پیوند لگے لباس
میں نہیں دیکھے گئے۔ گفتگو میں رکیک یا سخیف فقرے زبان سے نہیں نکالتے۔ گفتگو
آہستہ کرتے، مسکرا کر کرتے، لہجہ ہمیشہ نرم پُر وقار یا شگفتہ ہوتا۔ میں نے اُن کو کبھی
مایوس، مضمحل یا مضطرب نہ پایا۔ اُن کے ملنے والے مختلف یا متضاد مشرب کے
لوگ بھی تھے۔ لیکن وہ گفتگو اس انداز سے کرتے کہ اپنی وضع بھی ہاتھ سے نہ جاتی،
اور دوسرا بھی مایوس یا منغض نہ ہوتا۔

الہ آباد میں پہلے پہل اُنھوں نے کٹرہ میں ایک مکان دو کانوں کے ذیل میں
لب سڑک لے لیا تھا۔ بیٹھک میں براق چاندنی کا فرش، تین چار گاؤ تکیے الماریوں
پر روغن دیوار پر قلعی ملنے گیا تو پوچھا، کیوں مکان ملنے میں تو دشواری نہیں ہوئی
میں نے کہا جی نہیں البتہ ذرا شبہ ضرور ہوا کہ آپ کا مکان ہے یا اجمل خاں کا مطب
خدا کے لیے اس جگہ کو چھوڑیے۔ لوگ بیٹھے ہوں تو شبہ ہو کہ یا تو مخصوص امراض
کے مریض جمع ہیں یا آپ خاص قسم کے پیر ہیں، گھوڑے پر چوکا لگانے سے فائدہ؟
تعجب ہے آس پاس کے دوکانداروں نے آپ پر اب تک حملہ کیوں نہیں کر دیا۔
اگر جلد چھوڑنا ممکن نہ ہو تو ہومیو پیتھک دواؤں کا کاروبار کیوں نہ شروع کر دیجیے
ہنس پڑے فرمایا بات ٹھیک کہی مجھے صفائی بہت پسند ہے لیکن معلوم نہیں کیوں
جب آتا تو ہیک نظریہ صفائی خود مجھے کھٹکتی تھی۔ بازار میں کوئی چیز نئی آتی تو اُسے

فوراً خرید تے، دوستوں کو دکھائی کوئی پسند کرلیتا تو اُسی کو نذر کر دیتے۔ ایک دفعہ مراد آباد سے نہایت باریک اور نازک نقشے کی سینی لائے، راستہ میں میرے ہاں ٹھہر گئے، سینی دکھائی، پوچھا کہئے کیسی ہے، میں نے کہا عشوہ ہے عشوہ۔ "فتوحات" میں سے ہے یا خریدی ہے؟ بولے جی نہیں، فتوحات کا یہاں کہاں گذر، میں نہ ملّا نہ انگریز۔ خوشی تو خریدنے کی ہوتی ہے۔ میں نے پوچھا کیا قیمت دی، کہنے لگے واہ پیر کی بھی کوئی قیمت ہوتی ہے، سنا نہیں ؎

جو کچھ کہا کہ ترا حسن ہو گیا محدود!

بس یہ آپ کی نذر ہے، وہ سینی اب تک میرے پاس ہے۔ بچوں کے گھر میں اسکی صورت مسخ ہو گئی ہے۔ کبھی نظر آجاتی ہے تو اُسے منگواتا ہوں اُسی میں کھانا منگا کر کھاتا ہوں، رنگ آمیزیاں غائب ہو چکی ہیں، نقوش دھندلے ہو گئے ہیں۔ میں حافظہ کا کچا ہوں، لیکن تاثرات دیر تک قائم رہتے ہیں۔ ان مٹتے ہوئے نقوش میں اصغر صاحب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور جاننے والے جانتے ہیں بچھڑے ہوئے دوست کی یاد تازہ ہو جاتی ہے تو اگلے پچھلے زمانے کے مسیحائی پردوں پر رنگ و آہنگ، خد و خال، رعنائی و زیبائی کے کیسے کیسے حزین و حسین نقشے بن بن کر مٹتے ہیں اور مٹ مٹ کر بنتے ہیں۔

کھانے پلانے کے بڑے شوقین تھے، میں آنے والا ہوتا تو عجیب عجیب اہتمام کرتے مرحوم کا انتقال فالج میں ہوا۔ پہلا حملہ سہنے کو سہہ گئے مگر ہاتھ پاؤں کمزور ہو گئے تھے، پاؤں مشکل سے ہموار پڑتے۔ آخیر میں الہ آباد کے سینٹ ہال کے سامنے بلویڈیر کے احاطہ میں ایک مکان کرایہ پر لے لیا تھا، مکان کے احاطے کے پھاٹک

تک ایک طویل راستہ تقریباً پون فرلانگ لمبا چلا گیا تھا۔ میرا الہ آباد پہونچنے کا
وقت متعین تھا۔ ہمیشہ انتظار میں اُنھیں اس طویل سڑک پر ٹہلتے پایا۔ اس میں
کبھی فرق نہ آیا۔ پہلے چست آڑا پاجامہ پہنتے تھے، بیماری کے بعد چوڑی مہریوں کا
پہننے لگے تھے۔ لمبا پھنسی آستینوں کا کرُتہ۔ سر پر سپید ٹوپی۔ ایک ہاتھ میں پانوں
کی ڈبیہ بٹوا، دوسرے میں مختلف اقسام کے سگار، سگریٹوں کے ڈبّے۔ آہستہ
آہستہ سر جھکائے قدم سنبھالتے، ٹہلتے ہوتے آتا دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے ہائے
اُن کا باغ باغ ہونا !

زبان سے مرحبا یا مبارک سلامت کچھ نہ کہتے۔ البتہ آنکھوں میں خوشی کی
چمک ایسی ہوتی کہ قلب میں اترتی معلوم ہوتی ہے۔ لبوں پر مسکراہٹ اور باتوں
میں شادمانی کی وہ گھلاوٹ کہ بیان سے باہر ہے۔ خوشی کا اظہار اپنے کسی ارادہ
یا اشارہ تک سے نہ ہونے دیتے لیکن سر سے پاؤں تک شگفتہ و زمزمہ سنج معلوم
ہوتے۔

باتیں تھوڑی بہت اب تک یاد ہیں۔ کہتے، جب سے بیمار پڑا ہوا ہوں
ذرا عیاش ہو گیا ہوں۔ ہر طرح کے پان تمبا کو فراہم رکھتا ہوں، یہ دیکھیئے ہر مارکہ کا
سگریٹ ہے۔ ہر ایک کا رنگ جدا ہے۔ ان میں وہی لطف آتا ہے جو مخصوص احباب
کی صحبتوں میں آتا ہے۔ اِسی قسم کی باتیں کرتے کرتے مکان پہونچتے۔ نوکر کو آواز
دیتے، ناشتہ لاؤ۔ فرماتے یہ لیجئے میں نے ہارلکس مالٹڈ ملک شروع کر دیا ہے۔
یہ اوولٹین کا گلاس ہے۔ یہ فورس ہے اور وہاں آپ نے کیونز مکھن کھائے ہیں۔
ذرا یہ پولسن بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔ غرض ہر چیز بڑے شوق و لطف سے پیش کرتے

پھر کہتے ناشتہ کر لیجئے، وہ بھی حاضر کیا جائے گا۔ مدتوں سے بانگ احتجاج دے رہا تھا۔ میں نے کہہ دیا تھا دن قریب ہیں آج اسے آپ دسترخوان پر چاروں شانے چت پائیں گے۔ یہ مرغِ مسلّم کا عنوان تھا۔

اور ہاں یہ پان لکھنؤ کا ہے، آپ علی گڑھ کے پانوں کا پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں، آج لکھنؤ اور بنارس کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ یہ برقی قوام ہے، وہ زعفرانی پتی ہے اور ہاں (نوکر کو آواز دے کر) ذرا وہ گولیاں تو لانا حکیم .... صاحب نے دی ہیں۔ کہتے تھے اُن کے مورثِ اعلیٰ نے شاہانِ اودھ کے لئے بڑے اہتمام سے اس کا نسخہ تیار کرایا تھا اس کا نام "آبروئے اودھ" ہے اِسے ضرور چکھئے، میں نے کہا ٹھیک ہے۔ لیکن اس سے علی گڑھ کی آبرو پر کیا اثر پڑے گا۔ کہنے لگے، لیتے جائیے جس کی آبرو خطرے میں دیکھئے گا دے دیجئے گا۔

یہ سب کچھ تھا لیکن خوب سمجھتا تھا کہ یہ سارا اہتمام اور لطفِ بیان میرے لئے تھا جو چیزیں اور جو باتیں مجھے پسند تھیں انھیں کو بڑھا چڑھا کر کے اپنی طرف سے پیش کر رہے تھے اور اس لطف و نزاکت سے کہ مجھے انکی حکمتِ عملی کو فاش کرنے کی ہمّت نہ ہوتی تھی۔ امرودوں کی فصل ہوتی تو اس کا ایک ٹوکرا ساتھ کر دینے کا کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتے۔ کبھی کہتے فلاں صاحب کو بھیجنے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ آجکل موجود نہیں ہیں، زیادہ تو میں نے رکھ لئے ہیں اور کچھ آپ لیتے جائیے۔ کبھی کہتے فلاں صاحب نے علی گڑھ میں فرمائش کی تھی، تھوڑے اُنھیں بھی بھیج دیجئے گا۔ ایک بار متعلقین وطن سے علی گڑھ آرہے تھے۔ راستہ میں چند گھنٹوں کے لئے الہ آباد میں اصغر صاحب کے وہاں ٹھہر گئے سب سے

چھوٹا بچہ احمد گود میں تھا مرحوم کو بچّہ کی شکل اور وضع قطع ایسی پسند آئی کہ ٹھیک دوپہر میں اسے گود میں لئے سنبھلتے لڑکھڑاتے پیدل اپنے ایک عزیز دوست کے وہاں پہونچے اصغر صاحب کو اس طرح آتے دیکھ کر ان کے دوست اور گھر والوں کو بہت تعجب ہوا۔ سب کے سب دوڑ پڑے کیونکہ اصغر صاحب کو ڈاکٹر نے چارپائی پر مسلسل لیٹے رہنے کی تاکید کی تھی، غذا بھی کم کر دی تھی۔ ہفتوں بعد چارپائی سے اٹھے تھے اس لئے بہت نحیف ہو گئے تھے۔ بہتیرا لوگوں نے سمجھایا اور نوکر نے مانگا۔ لیکن بچّہ کو گود سے نہ اُتارا۔ تھوڑی دیر بعد گود ہی میں لئے واپس ہوئے۔ شام تک اس کے ساتھ طرح طرح سے کھیلتے رہے حتیٰ کہ دودھ پینے کے لئے ماں تک جانے نہ دیا۔ کچھ دنوں بعد پوچھا کہ یہ آپ نے کیا کیا تھا، بولے آپ تو دیکھ چکے ہو۔ دوست کا بچّہ) کتنا خوبصورت معصوم اور پیارا بچہ ہے۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ بچّوں سے مجھے کتنی الفت ہے اور اس کے والدین میرے کتنے سچّے اور گہرے دوست ہیں۔ اس دن آپ کے متعلقین آئے تو میں نے احمد کو دیکھا آپ اندازہ نہیں کر سکتے اُسے دیکھ کر میرے دل پر کیا اثر ہوا۔ بھول گیا کہ بیمار نحیف ہوں۔ دل میں ایک عجیب جذبہ پیدا ہوا کہ احمد بچّوں سے زیادہ دل کش اور پیارا ہے۔ بدحواسی تو دیکھئے میں نے بچّو کے والدین سے بھی کہدیا کہ احمد نے بچّو کو زیر کر دیا۔ چنانچہ جس فاتحانہ انداز کے ساتھ میں گیا تھا اُس سے کہیں زیادہ فاتحانہ فخر و مباہات سے واپس آیا۔ احمد نے میری ایک کمی پوری کر دی۔ ایک بار خط آیا لکھا تھا۔ بلڈ پریشر اور احمد کی محبّت دونوں بڑھ رہے ہیں دیکھئے کیا انجام ہو۔ مجھے اچھے گلابوں کا بڑا شوق ہے مرحوم اسے جانتے تھے جب کبھی الٰہ آباد جاتا تو پتہ

لگائے ہوئے ہوتے کہ کہاں کہاں اچھے گلاب ہیں۔ اجنبی ہوتا تو اُس سے رسم و راہ پیدا کرتے مجھے لئے جاتے اور گلاب پسند کراتے ایک بار ایسے ہی ایک جگہ مجھے لے گئے۔ مالک سے زیادہ خود ہر گلاب کی تعریف کرتے۔ گلاب یونہی سے تھے میں نے اخلاقاً ایک آدھ کی ٹوٹی پھوٹی تعریف بھی کر دی۔ اصغر صاحب نے اُسے حاصل کرنے کے لئے ڈورے ڈالنے شروع کئے۔ میں نے موقع نکال چپکے سے کہدیا اصغر صاحب فکر نہ کیجئے سب کے سب معمولی درجے کے ہیں مرحوم کو غیر معمولی مایوسی ہوئی واپسی پر پوچھا کہ یہ آپ چپ کیسے ہوگئے، کہنے لگے کیا کہوں اُن گلابوں کے نادر ہونے اور اس شخص کے نامعقول ہونے کا بڑا شہرہ سنا تھا۔ گلابوں کے بارے میں تو آپ نے فیصلہ کر دیا، نامعقول ہونے کا حال مجھ سے پوچھئے۔ کم بخت کسی طرح رام ہی نہ ہوتا...... صاحب الہ آباد کے سب سے مقتدر آدمی کی معرفت اُسے قابو میں کیا گیا۔ اس کے ساتھ میں نے وقتاً فوقتاً جتنا اخلاق برتا ہے، الہ آباد کا کوئی معقول و شریف آدمی برتنا گوارا نہ کرے گا۔ ٹھیک ہے ایسے مہمل آدمی کے گلاب کیونکر عمدہ ہو سکتے ہیں! پھر خود ہی ہنس پڑے۔

مجھ میں ایک بدعادت یہ ہے کہ کہیں جاؤں علی گڈھ سے آخری گاڑی سے روانہ ہوں گا اور کام ختم ہو جانے پر پہلی گاڑی سے واپس آجاؤں گا مرحوم کی آخری علالت کے زمانے میں میرا جانا الہ آباد ہوا۔ صبح پہونچا شام کی گاڑی سے واپس ہونا چاہا۔ مرحوم چاہتے تھے کہ رات وہیں بسر کروں۔ ہزار ہزار طریقہ سے وقت ٹال دینے کی کوشش کرتے رہے۔ جب دیکھا کہ کام نہیں چلتا تو اصرار

کرنے لگے کہ چھٹی کا زمانہ ہے کوئی ہرج نہ ہوگا صبح چلے جائیے گا۔ میں ایسا بدبخت کہ نہ مانا اور شام ہی کی گاڑی سے واپس چلا آیا۔

کیا خبر کہ یہ آخری ملاقات اور پہلا اور آخری ہی اصرار تھا۔ میرے انکار پر ایسا معلوم ہوا جیسے مرحوم کے چہرے پر اوس پڑ گئی۔ لیکن کیا بتاؤں کس ضبط و پامردی اور کس مرحمت سے فرمایا۔ تو پھر آپ کی خوشی۔ وہ سماں اب بھی نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے تو اوقات سے نفرت ہو جاتی ہے اور اپنے اوپر لعنت بھیجتا ہوں۔ میں اس واقعہ کا تذکرہ نہ کرتا لیکن مرحوم کو میں نے جس طور پر اور جس حالت میں شکستہ خاطر کیا تھا اُس کی پاداش میں اپنی اس شقاوت کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں۔ اس اعلان و اعتراف سے کبھی کبھی امید بندھتی ہے کہ شاید اپنے نفس کی ملامت اور دوسروں کی لعنت کا ہدف بن کر کبھی اور کہیں اصغر صاحب مرحوم کی روح کا سامنا کرنے کی ہمت ہو سکے۔

دو ہی ایک روز کے اندر تار آیا کہ اصغر صاحب نے رحلت فرمائی دوسرے دن الہ آباد پہونچا۔ بلویڈ کا راستہ سونا تھا۔ طبیعت بے اختیار ہو گئی۔ خلوص و محبت و مرحمت کا وہ پیکر مجسم ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکا تھا۔ ایسا معلوم ہوا کہ جیسے زندگی کی بڑی مضبوط طناب ٹوٹ گئی۔ زندگی جو عبارت تھی دوست کی محبت و شیفتگی سے اس میں ایک خلاء پیدا ہو گیا۔ ایسا خلاء جس میں بیابانی برفستانی ہواؤں اور گورستانی سناٹوں کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ اب ہمہ تن شوق ہو کر میرا کون انتظار کرے گا۔ میری تحریروں پر کس کو وجد آئے گا۔

اور کون اسے مسرت و فخر سے لوگوں کو دکھاتا سناتا پھرے گا۔ کوئی مضمون

شائع ہوتا۔ سب سے پہلے اصغر صاحب کا ستائشی خط آتا۔ اصغر صاحب کی رحلت نے مضمون لکھنے کا ولولہ بڑی حد تک سرد کر دیا۔ میرے اچھے بُرے خیالات کا بیشتر حصہ مضمون لکھنے کے دوران میں بے سان و گمان معلوم نہیں کیوں اور کس طرح آ تا ہے۔ جب کوئی اچھا خیال یا فقرہ ذہن میں آتا تو اس کی خوشی ہوتی کہ اصغر صاحب اس کی داد دیں گے۔ اور لکھو بہتر لکھو کی اُمنگ پیدا ہوتی۔ اب وہ بات نہیں بعض باتیں کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طور پر قلم سے ایسی بھی نکل جاتی ہیں جن کے بارے میں مجھے اندیشہ رہتا ہے کہ شائد اس کی تہہ تک لوگ نہ پہونچیں یا پہونچنا گوارا نہ کریں۔ اصغر صاحب ہمیشہ اسے پا جاتے، داد دیتے اور ملاقات ہوتی تو سب سے پہلے اُسی پر گفتگو کرتے۔

اس واقعہ کے بیان کرنے سے یہ مقصود نہیں کہ میں کوئی بڑا صاحبِ فکر ہوں یا لوگ میری بات نہیں سمجھتے تو کسی نعمت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ہرگز نہیں، شخصی تجربات یا تاثرات کے لئے غیر معمولی فراست یا علمیت لازمی نہیں ہے یہ تو ہر شخص کے بھید ہوتے ہیں جن سے وہ خود ہی زیادہ واقف ہوتا ہے۔

فالج کے حملے کے بعد سے ڈاکٹروں نے اُن پر بہت سی پابندیاں عائد کر دی تھیں جن پر وہ محض اس وجہ سے عامل رہتے تھے کہ ڈاکٹر کا حکم تھا ورنہ مرض کے انجام سے ڈرتے نہ تھے۔ غذا یا رہنے سہنے کے سلسلے میں جو پرہیز بتایا گیا تھا۔ اُس میں عجیب لطافتیں پیدا کر لی تھیں۔ خون کا دباؤ بے حد تھا لیکن وہ قریب قریب بھلے چنگوں کی طرح رہتے تھے۔ ایک بار ڈاکٹر نے کہا خون کے اِس دباؤ کے ہوتے ہوئے آپ کا زندہ رہنا بھی کرامت میں سے ہے۔ اصغر صاحب نے کہا بہت ممکن ہے موت

اسی سے واقع ہو لیکن زندہ رہنے کے اور ہی گر ہیں۔ زندہ رہنے میں ارادہ کو بڑا دخل ہوتا ہے ہوش میں رہ کر تو مروں گا نہیں بے خبری میں آپ کا بس چلے تو موت سے نپٹ لیجئے گا۔ ایسا ہی ہوا مرحوم رات کے کھانے پر دوستوں میں سے کسی کے ہاں مدعو تھے۔ سب لوگ ہنس بول رہے تھے کہ فالج کا شدید یک بخت حملہ ہوا اور چند گھنٹے مطلق بے خبری کے عالم میں رہ کر ہمیشگی میں مل گئے اصغر صاحب زندگی کے بہت سے نشیب و فراز سے گذرے تھے۔ طرح طرح کی صحبتیں دیکھی تھیں لیکن انھوں نے خودداری اور پاس وضع کا دامن ہاتھ سے نہ دیا۔ جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں، ان کا شاعر ہونا، اتفاقی تھا۔ وہ کچھ ہوتے تو بھی اسی رنگ پر قائم رہتے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بہت سے ملنے والوں سے ملتا ہوا۔ قلندر، ارباب علم و فکر، صاحبِ باطن، اصحاب و دل، بکواسی و بے بہرہ، طالب علم، کاروباری لوگ ہر ایک کو ان کا قائل پایا۔ ان کے دشمن بھی کم نہ تھے۔ جنھوں نے مخالفت میں وہ سب کیا جو وہ کر سکتے تھے۔ لیکن اصغر صاحب کو گھٹیا کسی نے نہیں بتایا۔ ان کے جاننے پہچاننے والوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو بڑے بڑے مناصب پر فائز تھے جن کی قابلیت اور شخصیت مسلم تھی وہ بھی بڑا لحاظ کرتے تھے مرحوم میں وہ بات نہ تھی جو ساحروں، فاتحوں میں ہوتی ہے کہ ان کے سامنے رہئے تو سب کچھ بعد میں کچھ نہیں۔ مرحوم تسخیر نہیں کرتے تھے بلکہ لوگ ان کو ہر حال میں عزیز رکھتے تھے۔ اور ان کی عزت کرتے تھے۔ ان کی ایک خاص طرح کی بڑائی تھی جس کا ہر بڑائی کو لحاظ رکھنا پڑا تھا۔ جامعہ ملیہ دہلی میں طرحی مشاعرہ تھا شعر خوانی اور شعر سرائی ہو رہی تھی۔ اصغر صاحب کی باری آئی مرحوم کی آواز طبعاً پست تھی۔

شعر پڑھنے شروع کئے تو مجمع میں انتشار پیدا ہوا مرشد (ذاکر صاحب) پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ یک بیک اصغر صاحب سے پرچہ لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور شعر سُنانے شروع کر دیے۔ ایک شعر یاد رہ گیا ہے ؎

زلا تسخیر کردم این جہانِ مہر و انجم را

زجوشِ بندگی پروردگارے کردہ ام پیدا

میں جانتا ہوں مرشد کا یہ اضطراری فعل کسی راز کی غمازی کر رہا تھا، اور مرشد کے اضطراری فعل کا کیا درجہ ہوتا ہے۔ ان کے چند ہی اضطراری آنسوؤں نے علی گڑھ کی آبرو رکھ لی، اور جامعہ بنا دیا اور مسلمانوں میں ایک نژاد نو کی طرح ڈالی۔ اصغر صاحب مشاعروں کے بالکل دلدادہ نہ تھے لیکن کہا کرتے تھے کہ طالب علموں کی دعوت رد کرنا گناہ ہے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ ان میں بے راہ روی ضرور پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن یہ قصور ہمارا ہے ہم میں نظر و فکر کی وہ گہرائی اور وسعت باقی نہیں رہی جو نژاد نو کی رہبری کر سکے جگر صاحب سے ان کے خاص تعلقات تھے وہ ان کی بے راہ روی سے کڑھتے تھے لیکن بڑی محبت کرتے تھے۔ جگر صاحب خود فراموشی کے عالم میں بھی اصغر صاحب کا بڑا پاس کرتے تھے۔ مرحوم اکثر جگر صاحب سے کہتے تھے کہ جو جا ہو کر لو آنا تم کو یہیں پڑے گا۔ جگر صاحب ایسے غیور عزت پسند قانع اور سادہ مزاج شاعر کم دیکھنے میں آئے جن کو وہ اپنے نزدیک بزرگ یا بہتر سمجھتے ہیں۔ اس کا لحاظ اس طرح کرتے ہیں کہ جیسے پُرانے زمانے میں چھوٹے اپنے بڑوں کا کرتے تھے بایں ہمہ جگر صاحب ایسا منہ پھٹ آدمی بھی کم ملے گا۔ جاہ و شہرت سے مرعوب ہونا جانتے ہی نہیں اپنی اس افتادِ طبع پر عجیب نزاکتیں پیدا کر دیں۔ اب تو خدا کے

فضل سے مدتوں سے عالم ہوش میں رہنے لگے ہیں اور پچھلی عادت یک قلم ترک کر دی ہے میں نے ان کو خود رفتگی کے عالم میں دیکھا ہے اور بڑے سے بڑے شاعر اور شخصیت کو سخت سست کہتے سنا۔ لیکن اصغر صاحب کا نام آتے ہی ان کو یا تو سناٹے میں آتے دیکھا یا بے اختیار اشک بار پایا اور جگر صاحب کا اب تو یہ عالم ہے کہ وہ اصغر صاحب کے مخصوص انداز و اطوار میں اپنے کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی بعض باتوں کو اصغر صاحب کے باطنی تصرف کا طفیل سمجھتے ہیں اور اس پر خوش ہوتے اور فخر کرتے ہیں۔ اصغر صاحب کے کلام پر ان کی زندگی ہی میں بعض تنقید نگاروں نے سخت نکتہ چینیاں کیں۔ مرحوم کی نظر سے یہ سارے مضامین گزرے۔ لیکن میں نے آج تک ان کی زبان سے ناقدوں کو برا بھلا کہتے نہ سنا کہا کرتے تھے کہ ناقدوں کا درجہ بہت بلند ہے بشرطیکہ وہ مخلص اور سمجھدار ہوں خدا کا مفسر شاعر ہے اور شاعر کا مفسر نقاد ہوتا ہے۔ ایک دفعہ فرمایا تھا کہ لوگ اپنی افتادِ طبع کا احتساب کئے بغیر غزل یا غزل گو سے برہم ہونے لگتے ہیں۔ لوگ غزل سے بیزار ہیں۔ اس لئے کہ اس کے موضوع پسند نہیں کرتے حالانکہ اب غزل کا موضوع ہی نہیں بلکہ اس کا رنگ و آہنگ بھی بہت کچھ بدل گیا ہے۔ یہ نہیں دیکھنا چاہیئے کہ برے غزل گویوں نے کیا خرابیاں پھیلائیں۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ اچھے غزل گو کتنی خوبیاں پیدا اور کر سکتے ہیں اکثر کہا کرتے ہیں غزل کو مدِ نظر رکھ کر شعر نہیں کہتا اس کو کیا کروں کہ بلند گہرے نازک اور لطیف خیالات خود بخود غزل کے قالب میں ڈھل جاتے ہیں ــــ کاش میرے خیالات و احساسات کوئی دوسرا پیکر اختیار کر لیتے مجھے قطعاً افسوس نہ ہوگا اگر وہ غزل نہ کہلائیں۔ ایک دفعہ عرض کیا اصغر صاحب آپ تو جتنے شعر چاہیں

کہہ سکتے ہیں ایسا کیوں نہیں کرتے کہ غزل میں صرف اوّل درجے کے شعر تو رہنے دیا کیجئے بقیہ کو حذف کر دیا کیجئے۔ مرحوم پر ایک جھرجھری طاری ہوئی پہلو بدل کر بیٹھ گئے۔ فرمایا رشید صاحب آپ ایسی باتیں کہتے ہیں۔ شاعر کبھی دوسرے درجے کی بات کہتا ہے ؟ کہہ بھی سکتا ہے؟ وہ تو ہمیشہ اول ہی درجے کے شعر کہتا ہے سننے والے کے نزدیک وہ اوّل درجے کا ہو یا دوم درجے کا۔ اس سے شاعر کو کیا علاقہ۔ آپ کے نزدیک وہ چھوٹی ہو تو ہو جب شاعر نے اُسے کہہ دیا تو وہ بڑی ہو گئی۔ کچھ دن اور گزریں گے تو یہ حقیقت آپ پر خود واضح ہو جائے گی۔

سجاد انصاری مرحوم سے بڑا لگاؤ تھا۔ کہتے تھے زندگی نے وفا نہ کی ورنہ خدا جانے کیا کرتے۔ ہم میں ایسے نقاد و مفکر کی بڑی ضرورت ہے کیونکہ اُردو میں خرافات نگاروں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے جس کا تدارک نہ کیا جائے تو ہونہار نوجوانوں پر زندگی تنگ ہو جائے گی۔ سر تیج بہادر کا بڑا احترام کرتے تھے۔ کہتے تھے سر تیج کا احترام کرنے میں لطف آتا ہے اس لئے کہ وہ احترام کی حرمت سے واقف ہیں۔ باتوں باتوں میں ایک دن فرمانے لگے کہ ان کی صحبت میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی حال میں نہ اپنی سطح سے اُتریں گے نہ حاضرین میں سے کسی کو اس حدود سے گزرنے دیں گے۔ اُردو ہندی کے سلسلے میں کہنے لگے کہ ہندوستان میں سر تیج بہادر سپرو اور پنڈت کیفی ہی ایسے ہندو ہیں جن کو اُردو سے برہنائے اُردو اُلفت ہے دونوں میں پُرانے زمانے کے مسلمان شرفا جیسی وضع داری ملتی ہے ایک بار ہندو مسلم اتحاد پر گفتگو آئی تو فرمایا کہ ہندوستان میں سر تیج ہی ایسے شخص ہیں جو جماعتی تعصب سے بلند ہیں۔ ہندوستان ایسے ملک کے لئے سر تیج ہی جیسے سردار کی ضرورت ہے،

اونچی جماعت کے مختلف الخیال طلبا اکثر ان کی صحبت میں دیکھے گئے۔ تعجب ہوتا ہے کہ یہ نوجوان جدید ترین افکار کے حامل ہوتے ہوئے کس طرح اصغر صاحب کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ مرحوم سے ایک دفعہ اس کی وجہ پوچھی، بولے دنیا میں ایک ہی مستقل علم تو ہے نہیں ہر علم کے تار و پود ایک دوسرے میں ملے ہوئے ہیں ایک ہی علم کی تکمیل مختلف علوم یعنی مختلف معلموں سے ہوتی ہے آپ تو جانتے ہیں کتابی اور اخباری علم (مسکرا کر) بزرگوں کے تصرف کا ہمیشہ محتاج رہے گا۔

مرحوم کے کلام پر گفتگو کرنے کا محل نہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ان کے کلام کو ان کی زندگی سے علیحدہ بھی نہیں کر سکتا۔ مرحوم کا ذکر چھیڑتا ہوں تو ان کا کلام سامنے آتا ہے اور کلام کی طرف رجوع ہوتا ہوں تو مرحوم جیتے جاگتے سامنے آموجود۔ ان کے کلام کو جسم و جان میں منتقل کیجئے تو اصغر صاحب اور اصغر صاحب کو الفاظ و عبارت میں تحویل کیجئے تو ان کا کلام۔

کلام سامنے آجانے سے مقصد ان کے اشعار کا یاد آنا نہیں ہے بلکہ جمال و کمال کی وہ مینا کاری و فردوس آرائی ہے جیسے ان کا کلام بروئے کار لاتا ہے ان کا کلام انھیں کی طرح محبت کرنے والا، رفاقت کرنے والا اور ترفع پیدا کرنے والا ہے اصغر آپ کو فکر کی زحمت نہیں دیتے یہ زحمت وہ خود اٹھاتے ہیں وہ اپنے فکر کے رنگین و رعنا نقوش سے آپ کی مدارات کرتے ہیں وہ بھی اس طرح کہ آپ پر کسی قسم کا بار نہیں ہوتا۔ یہی بات اصغر صاحب کی زندگی میں ملتی تھی۔

یہاں ضمناً اقبال کا بھی ذکر کر دینا چاہتا ہوں اقبال کے کلام کا مطالعہ کیجئے۔ حاتم طائی کے کوہِ ندا کی مانند وہ اپنی پہلی آواز پر آپ کو کشاں کشاں اپنے قدموں

میں لا ڈالیں گے اور آپ سے کچھ بن نہ پڑے گا۔ اصغر سے رجوع کیجئے وہ آپ کے ساتھ ہولیں گے۔ اقبال آپ کو سرِ مو اِدھر اُدھر نہ ہونے دیں گے۔ اصغر سے آپ خود علیحدہ نہ ہوں گے۔ اقبال حکومت کرتے ہیں، اصغر رفاقت کرتے ہیں۔ معنوی حیثیت سے دونوں جُدا ہیں اور اپنی اپنی وادی کے امام ہیں۔ الفاظ کے انتخاب اور انکے دروبست کے اہتمام (ترصیع) میں دونوں انتہائی احتیاط اور صناعت کاری کو دخل دیتے اور سلیقہ و شرافت کو ہاتھ سے نہیں دیتے۔

اصغر کی زندگی ہی سلیقہ، شرافت اور صداقت میں گذری۔ ظاہر ہے یہی رنگ ان کے کلام کا بھی ہوگا۔ اصغر سرتاسر غزل گو ہیں۔ لیکن ان کے کلام میں غزل کو مروجہ یا مسلمہ عریانی یا خامکاری نہ ملے گی۔ آپ ان کا کلام بے تکلف جس کے سامنے چاہیں پڑھ سکتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے الفاظ اور جذبات کو پورے طور پر ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ اور دونوں کو احتیاط اور سلیقہ سے کلام میں برتا ہے ان کے ہاں ترغیبات یا تجربات جنسی نہ ملیں گے بلکہ ان کی لطافتیں اور نزاکتیں، ان کی رفعتیں اور ان کی ذمّہ داریاں ان کے ہاں تفصیل نہیں تحلیل ہے، کیمیائی یا نفسیاتی تحلیل نہیں بلکہ شاعرانہ اور عارفانہ تحلیل۔ پھر وہ اس تحلیل کو الفاظ و معنی کیف و کم، رنگ و آہنگ کے ایسے فانوس میں گردش دیتے ہیں۔ کہ ہر شخص کو اپنے اپنے محبوب کا خد و خال نظر آتا ہے، عارفانہ بصیرت اور شاعرانہ صناعت کاری کی کرامت بھی یہی ہے۔

اصغر عوام کے شاعر نہیں ہیں ان کے کلام کے حسن و تاثیر سے لطف اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ آپ صاحبِ ذوق بھی ہوں، شاعری نہیں۔ دنیا کا ہر

سشریف فن کار ریاض اور رکھ رکھاؤ چاہتا ہے۔ اصغر صاحب کی شاعری اسی کا نمونہ ہے۔ اگر جدید اسکول اسے پسند نہیں کرتا تو یہ اصغر صاحب کا قصور نہیں ہے۔ قصور اور معیار کا ہے جس کے اصغر واضع تھے نہ مقلد نہ مداح۔ اصغر صاحب اپنے کلام کی حنبت میں ہمیشہ زندہ رہیں گے اور اچھے شاعر کی یہ سب سے بڑی پہچان ہے۔

اُردو غزل میں اصغؔر کا مقام

مجنوں گورکھپوری

اُردو غزل کی تاریخ میں اصغؔر کا مقام اور اس کی نوعیت متعین کرنا ذرا مشکل کام ہے۔ وہ منشی امیر اللہ تسلیم کے شاگرد تھے۔ یعنی ان کی شاعری کا نسب نامہ مومنؔ اور غالبؔ سے ملتا ہے۔ لیکن ان کے کلام کا مطالعہ ہم کو بتاتا ہے کہ وہ نہ خود کسی کے مقلد تھے اور نہ آج تک کوئی ان کی تقلید کر سکا۔ وہ تنہا اپنی ذات سے ایک دبستان ہیں۔ ایسا دبستان جو استاد کا کوئی شاگرد رشید نہ پیدا کر سکا۔ بقول شاعر "وہ اپنی ذات سے ایک انجمن ہے"۔ اور اس انجمن میں کوئی ان کا ساتھ دینے والا نہیں۔ اصغؔر کی شاعری کو تصوف کی شاعری بتایا جاتا ہے اور آج تک ہم اسی مبہم رائے کا اعادہ کرتے چلے آرہے ہیں لیکن اگر اصغؔر کے کلام کا اُردو اور فارسی کے صوفی شعرا کے کلام سے موازنہ کیا جائے تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر ان کو بھی تصوف کا شاعر کہا جائے تو یہ کس قسم کا تصوف ہے سطحی اور سرسری طور پر یہ کہہ دینا بڑی غیر تنقیدی بات ہے کہ اصغؔر کے کلام میں خیاؔم اور حافظؔ کا رنگ ملتا ہے۔ ایسوں کی کمی نہیں جو اصغؔر کی شاعری

میں جوش وخروش اور رندی اور سرمستی پاتے ہیں۔ لیکن یہ احساس وفکر کا دھوکہ ہے
اصغر کی شاعری میں حافظ کی سرمستی، خیام کی تیکھی حکیمانہ الا اوریت
(AGNOSTICISM) یا رومی کی تمثیلی عرفانیت نہیں ہے اگر ہم سے پوچھا جائے
کہ ایک لفظ میں اصغر کے کلام کی ممتاز خصوصیت کیا ہے تو ہم کہیں گے کہ طہارت یا پاکیزگی
لیکن یہ طہارت کیسی ہے اور یہ پاکیزگی کیا ہے؟ اصغر ایک طرف تو جسم کی ملبی کیفیات
کے دل ہی دل میں قائل معلوم ہوتے ہیں دوسری طرف وہ روح کی لطافت کو جسم سے
بے نیاز رکھنا چاہتے ہیں۔ اس نے اُن کے شعور میں ایک تضاد پیدا کر دیا ہے جس کا
خود ان کو شعور نہیں تھا یا شاید شعور تھا مگر اعتراف کرنا نہیں چاہیئے تھے ذرا یہ
اشعار سنیے جو زبان زد خاص وعام ہو چکے ہیں ؎

نمودِ جلوۂ بے رنگ سے ہوش اسقدر گم ہیں
کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

چمن میں چھیڑتی ہے کس ادا سے غنچہ وگل کو
مگر بادِ صبا کی پاک دامانی نہیں جاتی

میرے ساقی نے عطا کی تھی مئے بے درد وصاف
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے میں ہے

ان تینوں اشعار میں بے رنگی اور پاک دامانی کے تصوّرات قابل غور ہیں اس لئے کہ

یہ تصورات اصغرؔ کے نظام فکر اور ان کی شاعری کے اصلی عناصر ہیں لیکن ہم کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ غنچہ و گل کو چھیڑتے ہوئے پاک دامن رہنا چاہتے ہیں۔ اور ان کے بے رنگی کے تصور میں جلوہ یعنی رنگ داخل ہے۔ انھوں نے رنگ کو لطیف بنا کر بے رنگی کی سرحد تک پہونچا ہے اور بے رنگی کو طرح طرح کی رنگینیوں سے معمور کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجاز میں حقیقت دیکھنا بہت پرانی رسم ہے۔ مگر حقیقت میں مجاز کی رنگینیاں قائم رکھنا نئی بات ہے۔ اصغرؔ نے شاعری میں یہی کیا ہے۔ وہ ہماری مادی اور جسمانی زندگی کو بے اصل وجود نہیں بتاتے اور نہ وہ حقائق اور رموز کی دنیا کو ہمارے عالم احساس و ادراک سے باہر کوئی دنیا تسلیم کرتے۔ وہ نظر ناظر اور منظور تینوں کی وحدت (IDENTITY) کا پیغام دیتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اس اعتبار سے اگر کہیں ان کا کوئی ہم خیال اور ہم نوا ملتا ہے تو مغربی ممالک میں وہ ہم کو کبھی کبھی ہیگلؔ جیسے حکماء اور انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں کے مائل بہ تصوف شعراء کی یاد دلاتے ہیں۔ ان کی شاعری نہ مجاز کی شاعری ہے نہ حقیقت کی بلکہ دونوں کو ایک کرکے پیش کرتی ہے۔

اصغرؔ صوفیوں کے عام طریقوں کے برخلاف دونوں کو نہ صرف لازم و ملزوم سمجھتے ہیں بلکہ ان کو ایک ایسی مرکب حقیقت کی صورت دینا چاہتے ہیں جس کا تجزیہ نہ کیا جاسکے۔ اصغرؔ خود صوفی مزاج انسان ضرور تھے لیکن آج تک کسی ملا اور صوفی میں کردار و گفتار کی وہ نرمیاں اور شرافتیں نہیں ملیں جو اصغرؔ کی سیرت کی سب سے محیط اور اہم خصوصیت تھی۔ ان کو صوفی یا فلسفی کہتے ہوئے ہماری زبان ہچکچاتی ہے لیکن وہ ان معنوں میں محض شاعر بھی نہ تھے جن معنوں میں ان سے پہلے اور خود ان کے زمانے میں اور پھر ان کے بعد بڑے بڑے شعراء سمجھے گئے ہیں۔ اس لئے ہم یہ کہیں گے کہ اصغرؔ لغوی معنوں میں شاعر

تھے یعنی ان کو کائنات اور حیات انسانی کی معرفت حاصل تھی۔ ہم ان کو عارف کہیں گے لیکن یہاں پھر ہم کو اس التباس سے بچنا ہے جو عارف کے روائتی تصور سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اصغر کی شاعری جیسا کہ بتایا جا چکا ہے اپنے عنوان کی بالکل نئی چیز تھی۔ اور یہ عنوان ہم کو ان کے کسی معاصر یا ان کے بعد کسی غزل گو یا نظم نگار شاعر میں نہیں ملتا۔ خیالات کی پاکیزگی اور اسلوب کی نفاست اصغر کی شاعری کی ہموار اور مستقل خصوصیتیں ہیں۔ اصغر کا پورا کلام دو نہایت مختصر مجموعوں میں سمٹ آیا ہے جن کے نام "نشاط روح" اور "سرودِ زندگی" ہیں۔ اور ان کی شائد ہی کوئی غزل ہو جس میں سات آٹھ اشعار سے زیادہ ہوں۔ شائد ان کا کل کلام دیوان دردؔ سے بھی مختصر ہو۔ یہ اپنی جگہ ایک علامت ہے۔ اصغر کے مزاج کی نفاست اور ان کے شعور شعری کی پاکیزگی یہ گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ کثیر سے کثیر تعداد میں شعر کہیں اور اپنے دیوان کا حجم بلا وجہ بڑھا دیں وہ شعر اس وقت کہتے تھے جب کہ واقعی ان کے اندر کوئی احساس یا کوئی خیال ابھرتا تھا اور پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ اپنے تأمل کو تاثر اور تاثر کو تامل بنا دیتے تھے۔ ان کے جذباتی سے جذباتی اشعار میں ایک فکری میلان ہوتا ہے اور انکے حکیمانہ افکار میں ایک جذباتی ارتعاش (EMOTIONAL VIBRATION) پایا جاتا ہے۔ کچھ اشعار سنیئے ؎

تری نگاہ کے صدقے یہ حال کیا ہے مرا
کمال ہوش کہوں یا کمال بے خبری

اس کو درکار ہیں کچھ قلب و جگر کے ٹکڑے
جیب و دامن نہ کوئی پھاڑ کے دیوانہ بنے

رند جو ظرف اٹھالیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

سارے عالم میں کیا تجھ کو تلاش
تو ہی بتلا ہے رگِ گردن کہاں

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

جینے کا نہ کچھ ہوش نہ مرنے کی خبر ہے
اے شعبدہ پرداز یہ کیا طرزِ نظر ہے

یکایک توڑ ڈالا ساغر ہاتھ میں لے کر
مگر ہم بھی مزاج نرگسِ رعنا سمجھتے ہیں

یہ تھوڑی سی مے ہے اور یہی چھوٹا سا میخانہ
اسی سے رند رازِ گنبدِ مینا سمجھتے ہیں

کوئی محمل نشیں کیوں شاد یا ناشاد ہوتا ہے
غبارِ قیس خود اٹھتا ہے خود برباد ہوتا ہے

یہ سب نا آشنائے لذتِ پرواز ہیں شاید
اسیروں میں ابھی تک شکوۂ صیاد ہوتا ہے

قفس کیا، حلقہ ہائے دام کیا، رنجِ اسیری کیا
چمن پر مٹ گیا جو ہر طرح آزاد ہوتا ہے

یہاں کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

ذرّوں کو یہاں چین نہ اجرام فلک کو
یہ قافلہ بیتاب کہاں گرمِ سفر ہے

وہ نغمہ بلبلِ رنگیں نوا اک بار ہو جائے
کلی کی آنکھ کھل جائے چمن بیدار ہو جائے

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

یہ اور اس قسم کے بہت سے اشعار اصغر کے دیوان میں جو محض تصوّف نہیں کہے جا سکتے۔
شاعر کی فکر و بصیرت اپنے زمانے کی نئی زندگی کے میلانات اور ان کی ہم آویزی کا پورا

احساس لئے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ احساس ہیجانی یا پر فراش نہیں۔ اس میں ایک عارفانہ توازن اور سنجیدگی ہے۔ اصغر نہ کبھی افکار و جذبات میں غیر متوازن رہے اور نہ اسلوب بیان میں۔ بڑے نرم اور تھمے ہوئے لہجے میں وہ زندگی کے دردناک سے دردناک حقائق کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ہم کو زندگی سے برداشتہ خاطر یا بیزار نہیں ہونے دیتے۔ بلکہ ہمارے اندر ہستی کے آغاز و انجام اور اس کی ناگزیر رفتار کا درک پیدا کر کے دلوں میں زندگی کی ایک نئی نشاط انگیز تاب پیدا کرتے ہیں۔ اور اس لئے ہم اپنی روح میں ایک بالیدگی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ فکر اور اسلوب دونوں کے اعتبار سے اصغر کی شاعری مجملاً لطیف اور متین ہی کہا جا سکتا ہے ان کے خیال اور ان کے طرز بیان دونوں میں وہی پاک دامنی محسوس ہوتی ہے جو انھوں نے بادِ صبا میں محسوس کی ہے۔ باوجود اس کے کہ چمن میں شائد ہی کوئی کلی یا پھول ایسا ہو جس کو اس نے نہ چھوا یا چھیڑا نہ ہو۔

اصغر کے مطالعہ کرنے والوں میں سے شائد ہی کوئی نیک نیت ایسا ہو جو ان کی شاعری کا قائل نہ ہو جائے لیکن یہ بھی ایک عجیب طرح کا طنز یا ستم ظریفی ہے کہ اول تو نئی نسل میں گنتی کے ایسے شاعر نکلیں گے جنھوں نے اصغر کو اپنا نمونہ بنایا ہو یا ان کی تقلید کرنے کی کوشش ہو۔ اور جن لوگوں نے ان کی تقلید کرنے کی کوشش کی انکی شاعری بھونڈی ہو کر رہ گئی۔ اور تو اور جگر جو روزِ ازل سے اصغر کی شخصیت سے مرعوب تھے اصغر کے رنگ میں ایک بھی اچھا شعر نہ کہہ سکے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے۔ اسکی مثالیں اُردو ہی میں نہیں بلکہ دنیا کی اکثر زبانوں میں ملیں گی کہ ایک شاعر اپنی ذات سے بہت بڑا شاعر ہوا ہے مگر وہ آئندہ نسل شاعری کیلئے موثر قوت ثابت نہ ہو سکا۔ اصغر کا شمار بھی ایسے ہی شاعروں میں ہے۔ انکی شاعری اپنی جگہ ایک نیا میلان اور ایک

نیا عنوان تھی۔ لیکن ان کی ساری قوت انھیں کے ساتھ ختم ہوگئی۔ اس کا سبب کیا ہے؟ نفاست فکر اور پاکیزگیِ اظہار میں اصغر کا حریف مشکل ہی سے نکلے گا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ کسی نے ان کی روایت کو (وہ اپنی جگہ یقیناً ایک روایت تھے) آگے نہیں بڑھایا غور کرنے کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اصغر بیک وقت دو دنیاؤں کے انسان تھے اور انھوں نے خود اپنی شاعری میں ان دو دنیاؤں کو ملانے کی کوشش میں جتنی بھی کامیابی حاصل کی ہو لیکن یہ دو دنیائیں تحقیق باہم متضاد اور مخالف اور ان دونوں کے درمیان ہم آہنگی یا کسی قسم کا فطری رابطہ پیدا کرنا محال تھا۔ یہ روحانیت اور جسمانیت کی دنیائیں ہیں۔ یہ تو ممکن ہے کہ جسمانی عالم میں تمام روحانی لطافتیں پیدا کری جائیں، یا رُوحانی عالم میں جسم کی تمام محسوس کیفیتیں لے آئی جائیں لیکن روح اور جسم کے فرق کے احساس کو قائم رکھتے ہوئے دونوں میں رقابت و موافقت پیدا نہیں کی جاسکتی۔

اصغر نے یہی کرنیکی کوشش کی ہے۔ انکی باتوں اور انکے اشعار سے برابر یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ جسم کی دنیا کو للچائی ہوئی نگاہ سے دیکھتے تھے لیکن روح کی دنیا کا رعب اُن پر ایسا چھایا ہوا تھا کہ وہ جسم کی نت نئی رنگینیوں کو آنکھیں کھول کر اور جی بھر کر دیکھتے ہوئے لجاتے تھے۔ یہ ہم آویزی اسکے بہترین اشعار میں محسوس ہوتی ہے اور شاعر کے دل کی ایک اندرونی الجھن کیطرف اشارہ کرتی ہے۔

لیکن اس ہم آویزی یا الجھن کو فرائیڈی نفسیات کی اصطلاح میں گرہ یا مرکب (COMPLEX) کہنا بڑی سطحی بات ہوگی۔ یہ زندگی کی صدیوں پرانی ایک پیچیدگی کو حل کرنے کی نہایت معصوم کوشش ہے۔

اصغر کی شاعری نے اور کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو ایک بڑا کام تو اس نے کیا ہی ہے ہم کو شریف انسان بنانے کی جیسی غیر شعوری کوشش اصغر نے اپنے شاعری میں کی ہے شائد عصر جدید کا کوئی دوسرا شاعر نہیں کرسکا۔

اصغر گونڈوی کی شاعری

ڈاکٹر سلام سندیلوی

موجودہ دور کے انسان نے عقل و خرد کے لاکھوں چراغ محفل کائنات میں روشن کر دیے ہیں۔ مگر فضائے دل میں اب بھی تاریکی موجود ہے۔ مادی عروج ہم کو اخلاقی پستی کی طرف لئے جا رہا ہے۔ ہم زہرہ و مشتری پر نظریں جمائے ہوئے ہیں مگر بذاتِ خود سنگ و خزف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خصوصاً نئی امریکی تحریکات نوجوانوں کو وحشیانہ عادات کو اپنانے پر مجبور کر رہی ہیں۔ نئی پود میں نرگسیت کی مسخ شدہ شکلیں نظر آتی ہیں۔ مثلاً آج ظلم پسندی کا رجحان (SADISTIE TENDEVCY) بہت عام ہے اسکے ساتھ ہی مظلومیت پسندی کا رجحان (MASDERIOTIE TENDEVCY) بھی کچھ ملکوں میں پھیلا ہوا ہے۔ اسکے علاوہ عریاں پسندی کا رجحان (VOYEURISTIE TEUDEVEY) ہپیوں کا ایک محبوب مشغلہ بن گیا ہے۔ جب نوعِ انسانی اس گمراہی کی حد تک پہونچ گئی ہے تو اس کا علاج روحانیت اور تصوف و معرفت ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ اس قسم کے تزکیۂ نفس کے لئے صوفی شعراء کا کلام ہمارے قلب کی تسکین کا باعث ہو سکتا ہے خصوصاً

اصغر کا کلام تو ہمارے لئے روحِ نشاط کی حیثیت رکھتا ہے اسی بنا پر دورِ حاضر میں اصغر
کے کلام کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔

اصغر گونڈوی کا آبائی وطن گورکھپور ہے۔ ان کے والد منشی تفضل حسین صاحب
گورکھپور کے محلہ الٰہی باغ میں رہتے تھے۔ ان کا مکان اب بھی شکستہ صورت میں موجود
ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ منشی تفضل حسین نے اس مکان کو کسی کے ہاتھ فروخت کر دیا
اور وہ شخص اس کو فروخت کر کے پاکستان چلا گیا۔ اس لئے یہ مکان کسٹوڈین کے قبضہ
میں آگیا۔ اب یہ مکان ایک ملّاح کی ملکیت میں ہے۔ جس کو اس نے کسٹوڈین سے خریدا
تھا۔ اس مکان کو محلہ الٰہی باغ کے باشندے "چاند سورج کا مکان" کہتے ہیں۔ مگر
اس کی وجہ تسمیہ باوجود تفتیش کے نہیں معلوم ہو سکی۔ کچھ بھی ہو، اصغر گونڈوی اسی
چاند سورج کے مکان میں ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ آج وہ آسمان
شاعری پر چاند سورج بن کر چمک رہے تھے۔

اصغر گونڈوی کے والد صاحب گونڈہ میں صدر قانون گو کی حیثیت سے کام
کرتے تھے۔ اس لئے اصغر کا ابتدائی زمانہ گونڈہ ہی میں گذرا۔ انھوں نے عربی، فارسی
اور اُردو کی ابتدائی تعلیم بھی گونڈہ ہی میں حاصل کی۔ اس کے بعد انھوں نے گورنمنٹ
ہائی اسکول گونڈہ میں انگریزی تعلیم کے لئے داخلہ لیا مگر ہائی اسکول نہ پاس کر سکے۔
اس لئے انھوں نے ملازمت کی کوشش کی۔

اصغر گونڈوی کی رندی اور عیاشی کی داستان سید رشید احمد صاحب نے
"قومی آواز" (اکتوبر۔ نومبر ۱۹۷۸ء) کے مضامین میں ہم کو سنائی ہے۔ انھوں نے
بتایا ہے کہ جب وہ ریلوے کے محکمہ میں ٹائم کیپر ہوئے تو بابو راج بہادر ہیڈ کلرک کی

صحبت میں مے نوشی شروع کر دی۔ چنانچہ "جام مئے توبہ شکن، توبہ مری جام شکن" کا سلسلہ ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۲ء تک چلتا رہا۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے اسی دوران میں چھبّن نامی طوائف سے بھی تعلقات پیدا کر لئے۔ وہ بہت زیادہ حسین تو نہ تھی مگر "کم خرج بالا نشین" کی فسوں کاری نے ان کو ایک عرصہ تک اپنی زلفوں میں اسیر رکھا۔

۱۹۱۲ء میں اصغر صاحب کی زندگی میں ارتفاع (SUBLIMATIOR) کا موڑ آیا۔ ارتفاع کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ جنسی قوت (LIBIDO) کو غیر جنسی قوت (DESEXUALIZED PIBIDO) میں تبدیل کر دیا جائے۔ اصغر نے اپنی جنسی قوت کو ایک پاکیزہ اور لطیف موڑ دیا۔ موسم سرما کی ایک رات میں وہ کنور وشوناتھ ایڈوکیٹ کے مکان پر "چوباجیب نشینی و بادہ پیمائی" کے شغل میں مصروف تھے۔ اچانک ان کو ہوش آگیا اور انھوں نے مے نوشی سے توبہ کر لی۔ اس کے بعد پھر کبھی اس کا ذکر منہ نہیں لگایا۔ یہی نہیں بلکہ کوچۂ عصیاں کو بھی ترک کر دیا اور چھبّن نامی طوائف سے باقاعدہ نکاح کر لیا۔ اور اب وہ شریفانہ اور زاہدانہ زندگی گزارنے لگے۔ اس کے بعد ہی وہ شاہ عبدالغنی منگلوری کے مرید ہو گئے اور عرفان [illegible] میں داخل ہو گئے۔

اُردو شاعری میں تین ہی صوفی شعرا ایسے گزرے ہیں جن پر ہم ناز کر سکتے ہیں۔ متقدمین میں خواجہ میر دردؔ، متوسطین میں آتشؔ اور دورِ جدید میں اصغر گونڈوی۔ ان تینوں میں سے مجھے ذاتی طور پر اصغر کا کلام زیادہ پسند ہے۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ ان کے کلام میں جو نفاست اور نزاکت ملتی ہے اس سے دردؔ اور آتشؔ کا کلام بڑی حد تک محروم ہے۔ دراصل اصغر کا کلام ان کی شخصیت کا مکمل طور سے

آئینہ دار ہے۔ اصغر بذاتِ خود پاکیزہ اور مہذب زندگی گذارتے تھے، یہی پاکیزگی اور شستگی ہم کو ان کے کلام میں بھی ملتی ہے۔

اصغر رسمی طور پر صوفی نہیں تھے۔ اس لحاظ سے وہ غالب سے جدا ہیں۔ غالب کو "مسائلِ تصوف" میں دخل ضرور تھا اور اس طرح وہ خود کو ولی سمجھ کر اپنا دل بہلا لیتے تھے مگر وہ باطنی طور پر صوفی کی حیثیت نہیں رکھتے تھے (E. HERMAN) نے اپنی مشہور تصنیف (MEANING AND VALUE OF MYTICISM) میں صوفیوں (MYTICS) کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ پہلی قسم کے وہ صوفی ہیں جو روحانی تجربات کے حامل ہیں۔ دوسری قسم کے وہ صوفی ہیں جو تصوّف کی فلسفیانہ تشریحات میں ماہر ہیں۔ اس کی نظر میں پہلی قسم کے صوفی بہتر ہیں اور اس زمرہ میں سینٹ آگسٹائن (ST. AUGUS TINE) پلاٹینس (PLOTINUS) انجیل آف فالگنو (ANGLE OF FOLIGNO) اور جولین آف نارویچ (GULIAN OF NORWICH) وغیرہ شامل ہیں۔ اس نے دوسرے جملہ میں وکٹوریس (VICTORIOUS) پروکلس (PROCLUS) ڈیونیسیس (DIONYSIUS) وغیرہ کی جگہ دی۔ اسی قسم کی تفریق حضرت داتا گنج بخش ہجویری نے "کشف المحجوب" میں کی ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ معرفت کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم کا نام معرفت علمی ہے۔ جس کے ذریعہ دنیا اور عاقبت کے بارے میں معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ یہ علم حکما کو حاصل ہوتا ہے۔ دوسری قسم کی معرفت حالی ہے۔ اس معرفت کی مدد سے انسان کی رسائی خدا تک ہو جاتی ہے اس قسم کا علم صوفیا کو حاصل ہوتا ہے، دراصل اصغر گونڈوی ای۔ ہرمین کے نظریہ کے مطابق روحانی تجربات کے حامل ہیں۔ اور حضرت داتا گنج بخش ہجویری کے نقطہ نظر

سے وہ معرفت حالی سے بہرہ ور ہیں۔ اس لئے اصغر کا تصوّف حال ہے قال نہیں ہے۔

اصغر کا تصوّف دردؔ اور آتشؔ کے تصوّف سے جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ دردؔ کی صوفیانہ شاعری میں تصوّف کے مسائل کی جھلک زیادہ ملتی ہے۔ اس لئے اس میں بڑی حد تک خشکی اور بے کیفی پیدا ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ دردؔ کے تصوّف کا نمایاں عنصر غم والم ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کا عہد بہت پرآشوب تھا۔ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے دلّی پر حملہ کیا اور ۵۸ دن تک اس شہر کو تاخت وتاراج کرتا رہا۔ اس کے بعد احمد شاہ ابدالی ۱۷۴۸ء میں دلّی پر فوج لے کر چڑھ آیا۔ اس کے حملوں کا سلسلہ ۱۷۶۱ء تک جاری رہا۔ پھر اسی دَور میں مغل بادشاہوں کی حکومت بدلتی رہی۔ احمد شاہ معزول کیا گیا۔ عالمگیر ثانی کا قتل ہوا۔ شاہ عالم بادشاہ کی آنکھیں نکالی گئیں۔ یہ سارے کرشمہ دردؔ کی موجودگی میں ہوئے۔ اس لئے ان کے تصوّف پر غم واندوہ کی تاریکی لرزاں ہے۔ جہاں تک آتشؔ کے تصوّف کا تعلق ہے اس میں قناعت اور صبر وتوکّل کے چراغوں کی روشنی موجود ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ آتشؔ بذاتِ خود ایک مفلسانہ اور درویشانہ زندگی گزارتے تھے۔ مگر اصغر کی زندگی نہ تو مغموم تھی اور نہ مفلسانہ تھی۔ بلکہ وہ عیش وخوشی سے اپنی زندگی کے دن کاٹ رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تصوّف کی فضا میں مسرّت کی دھوپ چمکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ چنانچہ اصغر فرماتے ہیں ؎

غزل کیا اک شرارِ معنوی گردش میں ہے اصغر
یہاں افسوس گنجایش نہیں فریاد و ماتم کی

اصغر کا قول ہے کہ غزل میں فریاد وماتم کی گنجایش نہیں ہے بلکہ وہ غزل کو عیش د

نشاط کا ایک چھلکتا ہوا جام تصور فرماتے ہیں۔ دراصل اصغر کی ساری شاعری طربیہ ہے۔ اور ان کا یہی رنگ اُن کو دیگر صوفی شعرا سے جدا کرتا ہے

اصغر نے اپنے رنگِ سخن کے بارے میں ایک شعر اور کہا ہے ؎

اصغر نشاطِ روح کا اک کھل گیا چمن
جنبش ہوئی جو خامۂ رنگیں نگار کو

اصغر نے مندرجہ شعر میں بھی اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے ؎

شعر میں رنگینئ جوشِ تخیل چاہیئے
مجھ کو اصغر کم ہے عادت نالہ و فریاد کی

اصغر شعر میں رنگینئ جوشِ تخیل کے قابل ہیں۔ وہ رنگینی جو انسان کے مغموم جذبات کو نشاط کے سیلاب میں غرق کر دے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اصغر کے طربیہ اشعار میں ایک قسم کی سرمستی پائی جاتی ہے۔ مگر یہ سرمستی جگر کی سرمستی سے جدا ہے۔ جگر کے یہاں رندانہ سرمستی ملتی ہے مگر اصغر کے یہاں روحانی سرمستی موجود ہے۔ اصغر کے اشعار کے مطالعہ سے ہم پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہ وہی کیفیت ہے جس کو جذب (ECSLASY) کہہ سکتے ہیں اور جس کی بنیاد یونان کے نقاد لان جائنس (LONGINUS) نے تیسری صدی قبل مسیح ڈالی ہے۔ بعد میں اسی فلسفہ کو برگساں نے فروغ دیا ہے اور اس کا نام وجدان (IUTUITION) رکھا ہے۔

اصغر کی نشاطیہ شاعری کا ایک وہ بھی پہلو ہے جس کو ہم خمریہ کہہ سکتے ہیں۔ مگر ان کے جام میں بنتِ عنب رقصاں نہیں ہے بلکہ موجِ حقیقت لرزاں ہے۔ اصغر کے

اشعار میں مئے معرفت کا ذکر ملتا ہے۔ چونکہ اصغر اس سے قبل بادۂ مجازی کے نشہ کا تجربہ کر چکے تھے اس لئے اب وہ بادۂ حقیقی کا خمار حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ انھوں نے ایک ساغر کی شراب دوسرے ساغر میں انڈیل دی۔ یا یوں سمجھئے کہ "اڑ کے مے آگئی پیمانے سے پیمانے میں" بہرحال نئے ساغر کی شراب زیادہ کیف آور اور روح پرور ہے۔ چنانچہ وہ اس شراب کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

مجھ پہ نگاہ ڈال دی اس نے ذرا سرور میں
صاف ڈبو دیا مجھے موج مئے طہور میں

یہ نئی شراب یقیناً شرابِ معرفت ہے۔ کیونکہ اس کو اصغر نے "مئے طہورہ" کے نام سے یاد کیا ہے۔

اصغر کی شرابِ حقیقت کا رنگ اس شعر میں بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

اُس نے مجھے دکھا دیا ساغرِ مے اُچھال کر
آج بھی کچھ کمی نہیں چشمکِ برقِ طور میں

"چشمکِ برقِ طور" ترکیب اصغر کی شراب کو معرفت کی آب و تاب عطا کر رہی ہے۔ تصوّف کا ایک اہم اصول ہے "المجاز قنطرۃ الحقیقۃ" ہے۔ صوفی شعراء نے اس اصول کی روشنی میں بہت کچھ آنکھ مچولی کھیلی ہے۔ انھوں نے حسین لڑکوں سے محبت کی ہے اور ان کے عارض کی روشنی میں خدا کے جلوؤں کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ کاشغر کی ایک مسجد میں ایک حسین لڑکے کو درس میں مشغول دیکھ کر سعدی نے کہا ؎

اے دلِ عشاق بدامِ تو صید
ما بتو مشغول و تو با عمرو زید

جامی سلطان ابوسعید کے ملازم مرزا علی جان پر جان چھڑکتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلے میں انھوں نے ایک شعر کہا ہے ؎

جاردہ سالہ بتے پنجۂ جامی برتافت
کرد بیروں زکفش حاصلِ پنجہ سالہ

خواجہ میر درد کے یہاں بذاتِ خود ایسے بہت سے اشعار نظر آتے ہیں جن پر عشق مجازی کا دھوکہ ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے تصوف کا نقطۂ آغاز مجاز ہے۔ اور مرکز اختتام حقیقت ہے، مگر اصغر کے یہاں نقطۂ آغاز حقیقت ہے۔ اور مرکز اختتام مجاز ہے۔ اصغر حقیقت کے راستے سے مجاز کی منزل میں داخل ہوتے ہیں۔ اصغر نے حقیقی عشق کو مجازی رنگ میں پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تصوف میں امرد پرستی کی جھلک نہیں ہے۔ بلکہ ان کا محبوب حقیقی لباسِ مجازی میں جلوہ گر ہے۔ اصغر کا نظریہ ان کے مندرجہ ذیل اشعار سے واضح ہوجاتا ہے ؎

اس کا وہ قدِ رعنا اس پر وہ رُخِ رنگیں
نازک سا سرِ شاخ اک گویا گلِ تر دیکھا

تم سامنے کیا آئے اک طرز بہار آئی
آنکھوں نے مری گویا فردوسِ نظر دیکھا

رُخِ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی
شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی

بیدار ہوا منظر اس مست خرابی سے
غنچوں کی کھلیں آنکھیں، دامن کی ہوا آئی

اس عارضِ رنگیں پہ عالم وہ نگاہوں کا
معلوم یہ ہوتا ہے پھولوں میں صبا آئی

بکھری ہوئی ہے زلف بھی اِس چشمِ مست پر
ہلکا سا ابر بھی سرِ میخانہ چاہیئے

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی　　یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا
ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر　　تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

اصغر کی شاعری کا خاص موضوع عشقِ حقیقی ہے۔ چونکہ یہ عشقِ مجازی نہیں ہے، اس لئے اس میں آلودگی اور کثافت نہیں پائی جاتی ہے، بلکہ اس میں پاکیزگی اور لطافت ملتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اصغر نے ہوس اور عشق کے درمیان خط فاصل کھینچ دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

جب آگ دی ہوس میں تو تعمیرِ عشق کی
جب خاک کر دیا اسے عرفاں بنا دیا

اصغر کو اس کا علم ہے کہ خدا نے ایک مشتِ خاک میں عشق بھر کر عالم میں تلاطم برپا کر دیا ہے ؎

الٰہی کیا کیا تو نے کہ عالم میں تلاطم ہے　　غضب کی ایک مشتِ خاک نے پیدا آسماں کر دیا

اصغر کی شاعری میں جسم کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ بلکہ ان کے یہاں جسم کے بجائے جان اہم ہے ؎

تو نے یہ اعجاز کیا حسنِ پنہاں کر دیا
اس طرح پھونکا کہ آخر جسم کو جاں کر دیا

اصغر کی رگ رگ میں عشق ہی رچ بس گیا ہے، ان کے دو اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

میں کیا کہوں کہاں ہے محبت کہاں نہیں
رگ رگ میں دوڑی پھرتی ہے نشتر لئے ہوئے

سنتے ہیں تو غائب ہے، آنکھوں سے تو پنہاں ہے
رگ رگ میں کسک بن کر پھر کوں خراماں ہے

یہی عشقِ خداوندی ہے جس میں اصغر غرق رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کو آلامِ روزگار سے نجات حاصل ہو گئی ہے۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں ؎

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اُسے غمِ جاناں بنا دیا

اسی خیال کو اس سے قبل عرفی نے ایک حسین انداز میں پیش کیا ہے ؎

دردِ دل ما غمِ دنیا غمِ معشوق شود
بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما

عرفی نے اس شعر میں غمِ جاناں کا ذکر کیا ہے مگر اصغر کے یہاں غمِ یزداں کا ذکر ہے۔ اس لئے معنویت کے اعتبار سے اصغر کا شعر بلند ہے۔ مگر عرفی نے اپنے خیال کو ا

تمثیل کے ذریعہ واضح کیا ہے۔ اس لئے حسنِ بیان کے اعتبار سے عرفی کے شعر میں لطافت زیادہ ہے۔

اصغر نے مستقل ریاضت و عبادت کی مدد سے خدا کا عرفان حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس قسم کا عرفان اس شاعر کو حاصل نہیں ہو سکتا جو مادیت میں گرفتار رہتا ہے۔ اصغر نے ایک پاکیزہ زندگی اختیار کر لی تھی اور ہر وقت عبادت خداوندی میں مستغرق رہتے تھے۔ اسی لئے ان کو الٰہی سے آگہی حاصل ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دعویٰ کرتے ہیں ؎

جینا بھی آ گیا مجھے مرنا بھی آ گیا
پہچاننے لگا ہوں تمھاری نظر کو میں

اصغر نے خدا کی نظر کو پہچان لیا ہے، اس لئے اب ان کی نظر میں جینا مرنا برابر ہے

اصغر نے یہ بھی محسوس کر لیا ہے کہ وہی خدا کی محبت میں بے قرار نہیں ہیں بلکہ اُدھر سے بھی کچھ لطیف اشارے ہو رہے ہیں ؎

شعاعِ مہر خود بے تاب ہے جذبِ محبت سے
حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ شبنم کی

اصغر گونڈوی کے تصوف کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت مشاہدۂ حق ہے انھوں نے ریاضت و عبادت کی بنا پر صرف عرفانِ خدا ہی حاصل نہیں کر لیا ہے بلکہ اس کے دیدار سے بھی لطف اندوز ہوئے ہیں۔ اس لئے اب وہ "مسامرہ" اور "محادثہ" کی منزل میں داخل ہو گئے ہیں۔ دراصل اس مشاہدہ کی نوعیت کی تشریح بہت دشوار ہے، کچھ لوگ اس قسم کے دیدار پر اعتبار نہیں

کریں گے۔ مگر جلوۂ حق کے دیدار پر اہلِ سریت کو بھی کسی نہ کسی حد تک یقین ہے (E. LLNDER HILL) نے اپنی تصنیف [THE EOSENTIALS OF MYSTICIEM]
میں ایک فرانسیسی صوفیہ تھریسی مارٹن (THERESE MARTIN) کے بارے
میں لکھا ہے کہ ایک بار وہ بیمار پڑ گئی۔ اس نے حضرت مریم کے بت سے اپنی صحت کے
لئے دعا مانگی۔ یہ دیکھ کر اس کو سخت حیرت ہوئی کہ اس بت میں زندگی پیدا ہو گئی
اور وہ بت ایک مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھا۔ یا یہ صرف بے شعوری ہی پیکریت
(HALLUCINATRY IWAG BY) نے ایک اور فرانسیسی صوفیہ لوسی
کرسٹائن (LUCIE CHRISTINE) کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس صوفیہ کا قول ہے:

"The presence of good is no clear that faith is not faith it is eight."

لیوسی کرسٹائن نے واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ اس کی نظروں کے سامنے خدائی جلوہ
موجود ہے۔ نوراللہ شوستری نے "مجالس المومنین" میں شیخ ابوسعید ابوالخیر
اور بوعلی سینا کی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ شیخ نے بوعلی سینا سے ملاقات کے بعد کہا
"انچہ او می داند من می بینم" دراصل ابوسعید ابوالخیر صوفی صاف باطن تھے۔
اس لئے وہ خدا کا جلوہ چشم باطن کی مدد سے دیکھ سکتے تھے۔ اردو کے مشہور شاعر
اصغر گونڈوی بھی مشاہدۂ حق میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس قسم کا مشاہدہ مشق
و ریاضت پر منحصر ہے۔ اصغر نے ریاضت و عبادت کے خلوص کی بنا پر محبوب حقیقی
کے دیدار میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں ؎

ہر حال میں بس پیش نظر ہے وہی صورت　　میں نے کبھی روئے شب ہجراں نہیں دیکھا

اصغر کے اس شعر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان پر "بسط" کی کیفیت طاری ہے۔ صوفیانہ اصطلاح میں "بسط" اس عالم کو کہتے ہیں جب صوفی پر اسرار الٰہی نازل ہوتے ہیں۔ دراصل ہر صاف باطن صوفی پر خدا کے جلوؤں کی بارش ہوتی ہے۔ جب کبھی صوفی کی روح اس قسم کے جلوؤں سے محروم ہو جاتی ہے تو اس کو صوفیانہ اصطلاح میں "قبض" کہتے ہیں۔ جب شیخ ابوسعید ابوالخیر پر قبض کی کیفیت طاری ہوتی تھی تب وہ اپنے پیر شیخ ابوالفضل بن الحسن الرضی کے مزار پر حاضر ہوتے تھے اور بسط کے لئے دعا مانگتے تھے۔ خدا ان کی دعا قبول کر لیتا تھا۔ ابوسعید کی طرح حضرت اصغر پر بھی بسط کی کیفیات طاری ہو جاتی ہیں اور وہ اسرار الٰہی سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر اصغر ایک شعر میں فرماتے ہیں ؎

کیا فیض بخشیاں ہیں رخ بے نقاب کی
ذرّوں میں روح دوڑ گئی آفتاب کی

اصغر گونڈوی کو "بسط" میں کامیابی حاصل ہوئی ہے اسی بنا پر انھوں نے خدا کی فیض بخشیوں کا ذکر کیا ہے۔ اصغر مندرجہ ذیل شعر میں مشاہدہ حق سے ہمکنار ہیں ؎

طاقت کہاں مشاہدۂ بے حجاب کی
مجھ کو تو پھونک دے گی تجلّی نقاب کی

اصغر کے سامنے محبوبِ حقیقی موجود ہے اور ان کے ہوش و حواس کو برہم کر رہا ہے ؎

وہ سامنے ہیں نظامِ حواس برہم ہے
نہ آرزو میں سکت ہے نہ عشق میں دم ہے

اصغر کے روبرو جلوؤں کی فراوانی کا عالم ملاحظہ فرمائیے ؎

یہ جلوے کی فراوانی یہ ارزانی یہ عریانی

پھر اس شدت کی تابانی کہ ہم پردا سمجھتے ہیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ اصغر کے دیدہ و دل میں محبوب کے جلوے سمائے جا رہے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی ان کا ذوقِ نظر بھی برباد ہو رہا ہے ؎

سمائے جا رہے ہیں اب وہ جلوے دیدۂ و دل میں

یہ نظارہ ہے یا ذوقِ نظر برباد ہوتا ہے

غرضیکہ اصغر کو مشاہدۂ حق حاصل ہے اور یہ ان کے کامیاب تصوّف کی دلیل ہے۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ اصغر واضح طور پر خدا کا جلوہ دیکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی یہ جلوہ نظروں سے اوجھل بھی ہو جاتا ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصغر بعض وقت "حضور و غیب" کی دھوپ چھاؤں سے کھیلنے لگتے ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں ؎

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا

جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں تھا

اصغر نے ایک اور شعر میں "حضور و غیب" کے عالم کا نقشہ کھینچا ہے ؎

خیر گئی نظر کے ساتھ ہوش کا بھی پتا نہیں

اور بھی دُور ہو گئے آ کے ترے حضور میں

اصغر کی نظر سے بعض وقت محبوب کا جلوہ اوجھل ہو جاتا ہے اور ان پر قبض کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں ؎

وہ شوخیوں سے جلوہ دکھا کر تو چل دیے
ان کی خبر کو جاؤں کہ اپنی خبر کو میں

عام طور سے اصغرؔ مشاہدہ میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اس مشاہدہ کی بنا پر انکی شاعری میں سرمستی اور رنگینی پیدا ہوتی ہے۔

اصغرؔ گونڈوی صرف مشاہدہ ہی کی منزل میں نہیں ہیں بلکہ وہ حیرت کی منزل کی بھی سیر کر رہے ہیں۔ صوفیائے کرام کے نقطۂ نظر سے عشق الٰہی کے مختلف مدارج و مراحل ہیں۔ چنانچہ خواجہ عطار نے "منطق الطیر" میں عشق سات وادیاں مقرر کی ہیں۔

(۱) وادی طلب (۲) وادئ عشق (۳) وادئ معرفت (۴) وادئ استغنا۔
(۵) وادی توحید (۶) وادئ حیرت (۷) وادئ فنا۔

غرضیکہ وادئ حیرت عرفانِ الٰہی کا ایک درجہ ہے۔ خواجہ عطار وادئ حیرت کے متعلق فرماتے ہیں ؎

مردِ حیراں چون اسند در جائے گاہ
در تحیر ماندۂ گم کردہ راہ

اصغرؔ فرماتے ہیں ؎

نمودِ حسن کو حیرت میں ہم کیا کیا سمجھتے ہیں
کبھی جلوہ سمجھتے ہیں کبھی پردا سمجھتے ہیں

اصغرؔ کا مندرجہ ذیل شعر بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

اللہ رے ان کے جلوؤں کی حیرت فزائیاں
یہ حال ہے کہ کچھ نظر آتا نہیں مجھے

چونکہ اصغرؔ پر حیرت کی کیفیت طاری ہے اس لئے ان کو کچھ نظر نہیں آتا ہے۔ اصغرؔ تحیر کو حاصلِ نظارہ تصور کرتے ہیں

ہے حاصلِ نظارہ فقط ایک تحیّر
جلوے کو کہے کون کہ اب گم ہے نظر بھی

غرضیکہ تصوّف میں اصغرؔ پر حیرت بھی طاری ہو جاتی ہے۔ جو اس مسلک کی ایک اہم منزل ہے۔

جب صوفی کو معرفت حاصل ہو جاتی ہے اور وہ دیدارِ خداوندی سے فیضیاب ہو جاتا ہے تو اس میں شانِ استغنا پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں وہ ہر شے سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اس بے نیازی کے بارے میں خواجہ عطار "منطق الطیر" میں فرماتے ہیں ؎

می جہد از بے نیازی صرصرے | می زند بر ہم زیک دم کشورے
ہفت دریا یک شمر ایں جا بود | ہفت اختر یک شرر ایں جا بود
ہفت جنت نیز ایں جا بودہ است | ہفت دوزخ ہمچو یخ افسردہ است

غرضیکہ وادیٔ استغنا میں صوفی پر بے نیازی چھا جاتی ہے۔ اصغرؔ کے یہاں بھی بے نیازی کی شان موجود ہے۔ چنانچہ ان کا قول ہے ؎

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث میں
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

اصغرؔ غمِ دوراں سے قطعی طور پر بے نیاز ہیں۔ اسی لئے ان کو موجِ حوادث سے بھی خطر نہیں ہے۔ اصغرؔ کی بے نیازی کی حد یہ ہے کہ غم تو غم ہے وہ اپنی بے نیازی کی بنا پر خدا

کو بھی بھول جانا چاہتے ہیں ؎

ہوش کسی کا بھی نہیں جلوہ گہِ نماز میں
بلکہ خدا کو بھول جا سجدۂ بے نیاز میں

اصغر نے وحدت الوجود کے متعلق بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وحدت الوجود کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ کائنات میں خدا کے وجود کے علاوہ اور کسی چیز کا وجود ہی نہیں ہے۔ یہی خیال اصغر کا بھی ہے۔ وہ اپنے نقطۂ نظر کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ؎

جو نقش ہے ہستی کا دھوکا نظر آتا ہے
پردے پہ مصوّر ہی تنہا نظر آتا ہے

اصغر کے کہنے کا یہ موقعہ ہے کہ دنیا میں جتنی چیزیں ہیں سب فریب ہیں۔ صرف خدا کی ذات حقیقت ہے۔ اس قسم کا خیال اصغر نے ذیل کے شعر میں بھی ظاہر کیا ہے ؎

وہ شمع حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے
فانوس کی گردش سے کیا کیا نظر آتا ہے

اصل میں شمع حقیقت کا وجود ہے۔ مگر جب فانوسِ کائنات گردش کرتا ہے تو ہم کو مختلف پُر فریب اشیاء نظر آتی ہیں۔

اصغر نے ایک شعر میں وحدت الشہود کا تصوّر بھی واضح کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

نمایاں کر دیا اس نے بہارِ رُوئے خنداں کو
کہ دی نغمہ کو مستی، رنگ کچھ صبحِ گلستاں کو

اگرچہ خدا ہم کو نظر نہیں آتا ہے مگر اس کا جلوہ کائنات میں ہر طرف بکھرا ہوا ہے۔ چنانچہ وہ کبھی مستئ نغمہ کی شکل میں اور کبھی رنگِ صبحِ گلستاں کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ اصغر

نے اِس شعر میں نہایت حسین اسلوب کے ساتھ اپنے فلسفہ کا اظہار کیا ہے۔

اصغر کے تصوّف میں فنا کا مقام بھی آیا ہے۔ یہ سالک کی آخری منزل ہے۔ اس منزل پر پہونچ کر وہ ذاتِ حقیقی میں گُم ہو جاتا ہے، اور اپنی ہستی کو کھو دیتا ہے۔ اِس عالم میں وہ "من تو شدم تو من شدی" کا وِرد کرنے لگتا ہے۔ اصغر بھی فنا کی منزل پر پہونچ گئے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

اَب مجھے خود بھی نہیں ہوتا ہے کوئی امتیاز
مِٹ گیا ہوں اس طرح اُس نقشِ پا کے سامنے

اصغر کے گلدستۂ شاعری میں صرف تصوّف ہی کی بو نہیں ہے بلکہ اس میں فلسفہ کا رنگ بھی شامل ہے۔ اِسی لئے اس میں دلکشی اور دلبری حد درجہ موجود ہے۔ اصغر نے اپنے بعض اشعار میں فلسفۂ فنا کو پیش کیا ہے۔ ان کا قول ہے کہ انسان اور کائنات کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ جو اِن دونوں کو حقیقی تصوّر کرتے ہیں وہ وہم میں مبتلا ہیں۔ تصوف کی اصطلاح میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اصغر نے "قدیم" کو تسلیم کیا ہے اور "حادث" کو مسترد کر دیا ہے۔ یعنی "قدیم" حقیقی ہے اور "حادث" مصنوعی ہے۔

اسی قسم کے خیالات ماہرینِ نفسیات کے یہاں بھی ملتے ہیں۔ چنانچہ ڈوگس (DUGAS) نے ۱۸۹۸ء میں عدم جسمانیت (DEPERSONALIZATION) کی اصطلاح ایجاد کی۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہم کی بنا پر انسان اپنی ہستی کو باطل قرار دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ خارجی دنیا کو غیر حقیقی تصور کرتا ہے۔

اصغر گونڈوی کے یہاں بھی عدم جسمانیت کا تصوّر ملتا ہے۔ مثلاً وہ زندگی کو فریب کہتے ہیں ؎

کہتے ہیں لک فریبِ مسلسل ہے زندگی
اس کو بھی وقفِ حسرت و حرماں بنادیا

اصغر ہستی کو ایک خواب تصوّر کرتے ہیں ؎

اے کاش میں حقیقتِ ہستی نہ جانتا
اب لطفِ خواب بھی نہیں احساسِ خواب میں

یہی نہیں کہ اصغر زندگی کو دھوکا سمجھتے ہیں بلکہ وہ کائنات کو بھی فریبِ نظر تصوّر کرتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

خاموش یہ حیرت کدۂ دہر ہے اصغر جو کچھ نظر آتا ہے وہ سب طرزِ نظر ہے

یہ حُسنِ دوست ہے اور التجائے جانبازی تجھے یہ وہم کہ یہ کائناتِ عالم ہے

اصغر کے یہاں عقل و خرد کا بھی فلسفہ موجود ہے۔ وہ اقبال کی طرح عشق کو خرد پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا نظریہ ملاحظہ فرمائیے ؎

یہ عشق نے دیکھا ہے یہ عقل سے پنہاں ہے
قطرہ میں سمندر ہے ذرّہ میں بیاباں ہے

ہوش و خرد کے پھیر میں عمرِ عزیز صرف کی رات تو کٹ گئی یہاں، دیکھئے ہو سحر کہاں

اصغر کے تصوّف کی ایک یہ بھی خوبی ہے کہ ان کے یہاں انفعالیت نہیں ملتی ہے بلکہ وہ فعلیت کے قائل ہیں۔ یہی نظریہ ڈاکٹر اقبال کا بھی ہے۔ اصغر جب ملازمت کے سلسلے میں لاہور گئے تھے تو اُن کی ملاقات ڈاکٹر اقبال سے ہوئی تھی۔ اس کا امکان

ہے کہ انھوں نے فلسفۂ حرکت وعمل اقبال سے سیکھا ہو۔ اقبال کے یہاں حرکت ہی کا نام زندگی ہے۔ ان کے یہاں کافی ایسے اشعار نظر آتے ہیں جن میں حرکت پر زور دیا گیا ہے۔ مثلاً ساقی نامہ میں وہ جوئے کہستان کی تصویر یوں کھینچتے ہیں ؎

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی　　اٹکتی لچکتی سرکتی ہوئی
اچھلتی پھسلتی سنبھلتی ہوئی　　بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی

ان اشعار میں اقبال نے حرکت وعمل کے فلسفہ کو واضح کیا ہے۔ ان کی ایک نظم کا عنوان "پرواز" ہے۔ یہ نظم ملاحظہ ہو ؎

کہا درخت نے اک روز مرغِ صحرا سے　　ستم پہ غمکدۂ رنگ و بو کی ہے بنیاد
خدا مجھے بھی اگر بال و پر عطا کرتا　　شگفتہ اور بھی ہوتا یہ عالمِ ایجاد
دیا جواب اسے خوب مرغِ صحرا نے　　غضب ہے داد کو سمجھا ہوا ہے تو بے داد
جہاں میں لذّتِ پرواز حق نہیں اس کا　　وجود جس کا نہیں جذبِ خاک سے آزاد

اسی قسم کا خیال اصغر نے ذیل کے شعر میں ظاہر کیا ہے ؎

یہاں کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیّاد ہوتا ہے

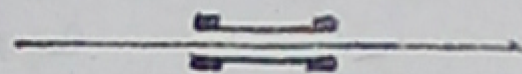
اس شعر میں اصغر نے کوتاہیٔ ذوقِ عمل کی مذمّت کی ہے۔ انھوں نے ایک اور شعر میں حرکت وعمل پر زور دیا ہے ؎

برگِ گل کے دامن پر رنگ بن کے جمنا کیا
اس فضائے گلشن میں، موجۂ صبا ہو جا

اصغر رنگ بن کر جمنے کے قائل نہیں ہیں بلکہ وہ موجِ صبا کی طرح حرکت کرنا پسند کرتے ہیں۔

اس بحث و مباحثہ سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اصغرؔ کا منصوفانہ کلام بہت ارفع و بلند ہے۔ ان کی شاعری میں پاکیزہ اور شستہ خیالات کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ یہی نہیں کہ موضوع کے اعتبار سے اصغرؔ کی شاعری بلند مرتبت ہے بلکہ اسلوب کے اعتبار سے بھی وہ قابلِ قدر ہے۔ اصغرؔ کے الفاظ بہت نرم و نازک ہیں۔ ان کی زبان میں شیرینی اور رنگینی پائی جاتی ہے۔ ان کے بیان میں نزاکت اور لطافت موجود ہے۔ ان کی فارسی تراکیب میں ترنم کا جادو جلوہ گر ہے۔ ان کے طرز میں ایک قسم کی ندرت اور جدت پائی جاتی ہے۔

دراصل اصغرؔ دورِ جدید کے ایک بڑے شاعر ہیں۔ انھوں نے شاعری کو پست اور رکیک خیالات سے پاک وصاف کیا۔ دورِ جدید کے ایک اچھے شاعر فانیؔ بھی ہیں اصغرؔ اور فانیؔ کا ذکر ایک ساتھ آتا ہے۔ فانیؔ کے یہاں جو غم و الم ملتا ہے وہ بہت دلدوز ہے۔ اسی لئے ان کی شاعری بھی پُراثر ہے۔ فانیؔ کے کلام کی عظمت سے انکار کرنے کی گنجائش نہیں ہے مگر اصغرؔ اور فانیؔ کے کلام میں فرق ہے۔ اصغرؔ طربیہ شاعر ہیں اور فانیؔ المیہ شاعر ہیں۔ اصغرؔ کی شاعری ایک حسین گلاب ہے۔ جس سے سرخی جھلکتی ہے۔ اور فانیؔ کی شاعری ایک دردیدہ دل ہے۔ جس سے خون ٹپکتا ہے۔



دیباچہ

اصغر گونڈوی

"نشاطِ روح" کو اکثر بزرگوں اور دوستوں نے پسند فرماکر میری حوصلہ افزائی کی، جس کے لئے ان کا منت گزار ہوں۔ بعضوں نے اس کے خلاف آواز بلند کی ان کا بھی اس لئے ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنے خیال میں میری کوتاہیوں اور خامیوں کو گوارا نہیں فرمایا۔ میں نیتوں کا محتسب نہیں۔ مجھے تو شکوہ سے زیادہ شکریہ میں مزہ ملتا ہے۔

اس اثنا میں وقتاً فوقتاً کچھ اور اشعار جو کہے تھے وہ آج "سرودِ زندگی" کے نام سے ناظرین کرام کے سامنے پیش ہیں۔ سہو و خطا جو لازمۂ بشریت ہے اس کا دلی اعتراف ہے۔ بلکہ بقول غالبؔ ؎

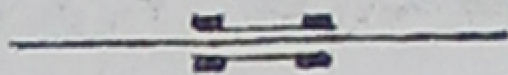
خوئے آدم دارم آدم زادہ ام
آشکارا دم ز عصیاں می زنم

باینہمہ ایک چیز کو کچھ لوگ پسند کرتے ہیں کچھ ناپسند اور اس میں وہ قطعاً معذور

بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ پسندیدگی و ناپسندیدگی کا دارومدار اکثر طبائع کی مناسبت اور عدم مناسبت پر ہے۔ اس کے لئے بحث، دلیل انتقاد تبصرہ جو چاہیئے لفظ استعمال فرمائیے۔ مگر وہ سب نام ہے اسی مناسبت و عدم مناسبت کی توضیح و تشریح کا اور بس۔

ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو بالقابہ اور مولانا ابوالکلام آزاد نے زبانی میری بہت کچھ ہمت افزائی فرمائی۔ جب کتاب کے چھپنے کا موقع آیا تو اپنے خیالات و تاثرات قلمبند فرما کر بھی مرحمت فرمائے۔ اس کے لئے ہمہ تن سپاس ہوں۔

یہ چند سطور ایسی حالت میں لکھ رہا ہوں کہ فالج سے صاحب فراش ہوں۔ جو کچھ اور جس قدر لکھنا چاہیئے تھا وہ ہو نہ سکا۔ امید ہے کہ احباب معاف فرمائیں گے۔



مقدمہ نشاطِ روح

مرزا احسان احمد بی اے ال ال بی، علیگ۔ اعظم گڈھ

عمریست کہ افسانۂ منصور کہن شد
من از سر نو جلوہ دہم دار ورسن را

اُردو کی موجودہ بزم سخن چند مخصوص اربابِ کمال کی ذات پر بجا طور پر فخر کرسکتی ہے اُن میں ایک بریگانۂ فن بھی ہے جس کی نازک خیالیاں درد آشنا قلوب کو ہمیشہ تڑپاتی رہیں گی۔

حضرت اصغر شاعرانہ حیثیت سے بالکل غیر معروف نہیں ہیں ان کی نظمیں اکثر جرائد ادبیہ میں شائع ہوئی رہی ہیں جن کی وجہ سے وہ مخصوص ادبی حلقوں میں کافی طور پر روشناس ہیں لیکن عام ادبی دنیا اب تک اُن کی حقیقی شاعرانہ عظمت سے ناآشنا ہے اس بنا پر جب حضرت جگر کے دیوان کی ترتیب واشاعت کے دوران میں مجھ کو اُن کا کچھ کلام ہاتھ آیا تو اُسی وقت سے میرا یہ ارادہ تھا کہ بزم ادب کی طرف سے ایک منتخب مجموعہ اربابِ سخن کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ تمہید

کے طور پر میں نے دسمبر ۱۹۲۱ء کے علی گڑھ میگزین میں کلامِ اصغر کے عنوان سے ایک مختصر سی تنقید لکھی تھی جس میں مَیں نے وعدہ کیا تھا کہ عنقریب جنابِ اصغر کا کلام مع اُن کے ذاتی حالات کے اربابِ ذوق کی خدمت میں پیش کروں گا لیکن افسوس ہے کہ متعدد اسباب کی وجہ سے اتنی مدت تک مجھ کو ساکت رہنا پڑا، لیکن اس خیال سے بالکل غافل نہیں رہا چنانچہ اس اثنار میں وقتاً فوقتاً جو کلام اخبارات و رسائل میں نظر پڑا جمع کرتا رہا، بلکہ اسی ضرورت سے ایک بار حضرت اصغر کی خدمت میں گونڈہ بھی گیا، لیکن اس جہاد کا کوئی معتدبہ نتیجہ نہ نکلا، چنانچہ وہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ ایک پوری بیاض کہیں ضائع ہو گئی ابتدائی کلام بھی کہیں محفوظ نہیں۔ غرض مجھ کو جناب اصغر سے خود کوئی معتدبہ مدد نہ ملی۔ بلکہ اُن کی اس شانِ بے نیازی پر مجھ کو افسوس ہوا کہ کیا کیا جواہر پارے رہے ہونگے، جن کی حیات افروز تجلّی سے اربابِ نظر کی نگاہیں ہمیشہ کے لئے محروم رہ گئیں۔

بہرحال حضرت جگر کی وساطت سے مجھ کو حضرت اصغر کا تھوڑا سا کلام شروع ہی میں مل گیا تھا، پھر میں نے خود اخبارات و رسائل سے لیکر کچھ جمع کیا، گو اس مجموعہ میں اشعار کی تعداد کم ہے تاہم اس خیال سے کہ اوّل تو آجکل ضخیم دواوین وکلیات شائع کرنا یوں بھی کچھ ضروری نہیں رہا۔ دوسرے اگر اتنا کلام بھی یونہی بے پروائی کی نذر رہا تو بعید نہیں کہ یہ قابل قدر ذخیرہ اُردو شاعری کے دامن سے ہمیشہ کے لئے جاتا رہے، میں نے ارادہ کر لیا کہ بلا کسی آئندہ تعویق و انتظار کے جو کچھ سرمایہ مرتّب ہو گیا ہے اربابِ ذوق کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔ لیکن افسوس ہے کہ عجلت کی وجہ سے اس مجموعہ کی ترتیب و اشاعت میں کچھ فروگذاشتیں رہ گئیں مثلاً چھپنے کے وقت متعدد غزلوں میں اکثر اشعار درج ہونے سے رہ گئے تھے۔ جن کا شائع ہونا

ضروری تھا، اگرچہ غزل کے سلسلہ میں ان اشعار کا کچھ اور ہی لطف ہوتا، تاہم محض تلافی
کے خیال سے وہ باقی ماندہ اشعار کتاب کے آخیر میں متفرقات کے تحت میں درج کر دیے
گئے ہیں۔ علاوہ اس کے ممکن ہے کہ عجلت میں کچھ اور اشعار بھی چھوٹ گئے ہوں جو
شائع ہونے کے قابل رہے ہوں اس لیے میں اس قسم کی فروگذاشتوں کے لئے علاوہ
ناظرین کے خود اپنے لائق دوست سے بھی معذرت خواہ ہوں۔ میں نے غزلیات کی ترتیب
عمداً ردیف وار نہیں رکھی کیونکہ یہ صرف عام روش کا اتباع تھا، بلکہ جہاں تک
ممکن ہو سکا۔ میں نے ترتیب غزلیات میں زیادہ تر زمانہ کا لحاظ رکھا ہے تاکہ اس کا
اندازہ ہو سکے کہ ابتدا میں کلام کا کیا رنگ تھا اور رفتہ رفتہ کیا ترقی ہوتی گئی۔ اس قسم
کی ترتیب سے شاعر کے ارتقائے تدریجی کا کافی طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے جو ردیف وار
ترتیب کی صورت میں ممکن نہیں۔"

ذاتی حالات حضرت اصغر کا اصل وطن گورکھپور کے ضلع میں ہے لیکن عرصہ سے
مستقل طور پر گونڈہ میں مقیم ہیں، جہاں اُن کے والد ایک مدت سے قانون گو کے عہدے
پر مامور تھے لیکن اب پنشن پاتے ہیں۔ اصلی نام اصغر حسین ہے اور تخلص اصغر ہے۔
یکم مارچ ۱۸۸۴ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و ترتیب معمولی اور غیر مستقل طور پر ہوئی کچھ
دنوں انگریزی مدرسہ میں تعلیم پا کر چھوڑ دیا۔ انٹرنس کے امتحان کے لئے تیاری کی لیکن خانگی
پریشانیوں کی وجہ سے امتحان نہ دے سکے۔ تاہم ایسی تھوڑی سی مدت میں فطری صلاحیت
کی وجہ سے اتنی استعداد پیدا ہو گئی کہ انگریزی کی ادبی کتابوں کا کافی لطف اُٹھا سکتے
ہیں۔ یہی حال عربی فارسی کا ہے جو کچھ قابلیت پیدا کی ہے وہ صرف اُن کے ذاتی مطالعہ
کتب اور غور و فکر کا نتیجہ ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ ایک صحیح الفطرت شخص کو خارجی

وسائل کی رہنمائی کی بہت کم ضرورت ہوتی ہے۔ خود اُس کی فطرت کی تجلّی اُس کے دل و دماغ کو منوّر کرتی رہتی ہے۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ حضرت اصغر نے باقاعدہ طور پر علوم و فنون کی تحصیل نہیں کی۔ اُن کی نظر میں علمی اور ادبی حیثیت سے جو وسعت اور لطافت ہے وہ قابلِ رشک ہے۔

شاعری میں بھی حضرت اصغر نے کسی کے سامنے مستقل طور پر زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا، ابتدا میں کچھ دنوں منشی خلیل احمد وجد بلگرامی کو اپنا کلام دکھاتے رہے آخر میں کچھ غزلیں منشی امیراللہ تسلیم کو دکھائیں۔ اُس کے بعد سلسلہ بند ہوگیا اور حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی استادی و شاگردی محض رسمی ہوتی ہے شاعر کا اصل رہبر اُس کا ذوق صحیح اور وجدان سلیم ہے جو رفتہ رفتہ اُس کو صراطِ مستقیم پر ڈال دیتا ہے۔ اخلاقی حیثیت سے حضرت اصغر ایک نہایت قابل قدر ہستی ہیں، باوجود زہد و تقویٰ کے مزاج میں رنگینی اور ظرافت کا عنصر بہت زیادہ موجود ہے۔ بادۂ تصوّف کے بھی خاص طور پر ذوقِ شناس ہیں۔ چنانچہ اُن کو ایک عرصہ سے حضرت قاضی شاہ عبدالغنی صاحب مدظلہ العلیٰ منگلور شریف سہارنپوری سے شرف بیعت حاصل کی اور حقیقت یہ ہے کہ حضرت اصغر کے کلام میں جو سوز و گداز ہے وہ اُسی وادیٔ ایمن کی شرر باریاں ہیں۔ لیکن باوجود لذّت شناس تصوّف ہونے کے حضرت اصغر دنیاوی تعلقات سے آزاد نہیں ہیں، چنانچہ گونڈہ میں اُن کا ایک چشمہ کا مستقل کارخانہ ہے جو ایک مدّت سے کام کر رہا ہے۔[1]

---

[1] اصغر مرحوم جب ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد میں رسالہ ہندوستان کے اڈیٹر تھے تو یہ کارخانہ بند کر دیا گیا تھا۔

اس وقت ملک میں اُردو لٹریچر کی توسیع و ترقی کے لئے مختلف قسم کی مرکزی انجمنیں قائم ہیں، لیکن افسوس ہے کہ اب تک اُن کا چمنستان امید حضرت اصغر جیسے ارباب فضل و کمال کے رشحاتِ کرم سے محروم ہے۔ ہمارے لائق دوست کی شانِ بے نیازی کو شائد اس نا قدر شناسی کی پروا نہ ہو لیکن ہم کو افسوس ضرور ہے کہ زمانہ کی سرد مہری اور بے اعتنائی کی وجہ سے دنیا آیندہ اِس جوہر قابل کی ادبی لطافت ریزیوں سے محروم ہوئی جا رہی ہے۔

خصوصیاتِ شاعری حضرت اصغر موجودہ زمانہ میں ایک ممتاز شاعرانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ غزل گو شعرا پر ایک خاص اعتراض یہ ہے کہ ان میں مسلسل نظم نگاری کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ لیکن حضرت اصغر اس الزام سے بَری ہیں۔ وہ مخصوص کیفیات پر نہایت خوبی اور لطافت کے ساتھ مسلسل نظمیں لکھ سکتے ہیں جس کا اندازہ صاحبِ ذوق اس مجموعہ کی ابتدائی نظموں سے کافی طور پر کر سکتا ہے لیکن چونکہ وہ ازل سے دردمند دل لے کر آئے تھے اس لئے اُنھوں نے اپنا خاص موضوع سخن تغزل ہی کو قرار دیا۔ جو فطرتِ انسانی کا سب سے زیادہ نازک اور لطیف جذبہ ہے۔ اگرچہ تغزل پر اس کثرت پر طبع آزمائیاں کی جا چکی ہیں کہ اُن پر کوئی معتد بہ اضافہ مشکل ہی معلوم ہوتا ہے تاہم حضرت اصغر کے خامۂ رنگیں نگار نے اِس نقشِ کہن میں وہ آب و رنگ بھر دیا ہے کہ اربابِ ذوق کی نگاہیں روشن ہو جاتی ہیں۔

فلسفہ و حکمت حضرت اصغر کو قدرت کی طرف سے ایک نکتہ رس اور بلاغت شناس دماغ عطا ہوا ہے اس لئے ان کی نظر عامیانہ جذبات کی سطح سے گذر کر رُوحِ انسانی کے اُن لطیف حقائق و معارف تک پہونچتی ہے جو دراصل عشقیہ

شاعری کی جان ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں ؎

کیا دردِ ہجر اور یہ کیا لذتِ وصال
اِس میں بھی کچھ بلند ملی ہے نظر مجھے

یہ صرف شاعرانہ تعلّی نہیں ہے بلکہ انصاف سے دیکھو تو اِس کا ایک ایک حرف حقیقت سے لبریز ہے۔ آجکل ملک میں فلسفہ گوئی کا ایک عام مذاق پھیلا ہوا ہے لیکن حالت یہ ہے کہ شعر پڑھتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی مولوی مغلق الفاظ میں وعظ کہہ رہا ہے حالانکہ شاعر کو یہ کبھی بھولنا نہیں چاہیئے کہ وہ شاعر ہے فلسفی نہیں ہے اگر اس کے اندازِ بیان میں شاعرانہ رنگینی اور لطافت نہیں تو اس کا تمام درسِ حکمت محض بیکار ہے پھر اس میں اور ایک مولوی میں کیا فرق رہ جاتا ہے اس کا اصلی طرۂ امتیاز یہی ہے کہ وہ دقیق خشک سے خشک مسائل کو اس رنگین پیرایہ میں ادا کرتا ہے کہ سامع پر ایک نشہ سا چھا جاتا ہے۔ حضرت اصغرؔ کی امتیازی خصوصیت یہی ہے کہ وہ حقائق نگاری کے ساتھ ساتھ شاعرانہ اندازِ بیان کی لطافت اور دلآویزی ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھتے ہیں محض خشک الفاظ میں فلسفہ لکھ دینا آسان ہے لیکن فلسفہ کے ساتھ ساتھ شعریت کا لحاظ رکھنا ہر شخص کا کام نہیں، اس نازک فرض سے وہی شخص عہدہ برآ ہو سکتا ہے جو حکیم بھی ہو اور شاعر بھی۔ حضرت اصغرؔ دونوں حیثیتوں کے جامع ہیں، اس لئے وہ عام شاہراہ سے الگ ہو کر اکثر حکیمانہ خیالات کا اظہار کرتے ہیں لیکن اِس طرح کہ شعریت کو کہیں صدمہ پہونچنے نہیں پاتا۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ علم و عرفان کا تقاضہ ہے کہ عالمِ کائنات اور اس کے مشاہد و مظاہر کو صرف ایک سراب بے بود تصوّر کر لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ایک حقیقت شناس نگاہ اس شاہدات

کی فریب کاریوں سے متاثر نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ غالبؔ نے جب یہ کہا ؎

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

تو یہ در اصل اسی بادۂ علم و عرفان کا نشہ تھا، لیکن فریب شہود کو فریب شہود سمجھ کر اس کی طلسم کاریوں کے سامنے سرِ عقیدت خم کر دینا در اصل بساط آرائے شہود کے منشاء کی تعمیل ہے۔ جو یقیناً علم و عرفان سے ایک بلند تر مقام ہے کیونکہ عالمِ موجودات کو فریب محض سمجھ کر اس سے کنارا کش ہو جانا مشیتِ ایزدی کے خلاف علمِ نافرمانی بلند کرنا ہے، بزمِ شہود فریب ہی سہی، لیکن اس فریب میں مبتلا ہی ہو جانا عین منشاء قدرت کی اطاعت ہے، یہی وجہ ہے کہ جلوہ گاہِ حقیقت کے محرمانِ خاص باوجود اس کے کہ ان کو دنیا کی بے ثباتی کا یقینِ کامل تھا، رزمگاہِ حیات میں ہمیشہ سرگرمِ عمل نظر آتے ہیں۔ اس بناء پر یہ مقام جہل یعنی فریب شہود کا دلدادہ بن جانا علم و عرفاں سے کہیں بلند تر ہے۔ ؎

مقام جہل کو پایا نہ علم و عرفاں نے

میں بے خبر ہوں باندازہ فریب شہود

غور کرو کہ یہ کس قدر دقیق فلسفیانہ نکتہ ہے جس میں شعریت پیدا کرنا کچھ آسان کام نہ تھا، چنانچہ جہاں تک پہلے مصرعہ کا تعلق ہے، اندازِ بیان خالص فلسفیانہ ہے۔ اور اگر مصرعۂ ثانی کا بھی یہی رنگ ہوتا، تو وہ کسی تصوف و حکمت کی کتاب کی کوئی سطر زریں ضرور بن جاتا، لیکن شعر کہلائے جانے کا مستحق نہ ہوتا۔ لیکن غور کرو کہ باندازہ فریب شہود، ٹکڑے نے انداز بیان میں کس قدر شعریت پیدا کر دی ہے اور شعریت

کے ساتھ ساتھ اس کی معنویت بھی کس حد تک بلند اور روشن کر دی ہے، چنانچہ یہ ٹکڑا اگر موجود نہ ہوتا تو معنوی لحاظ سے شعر میں کوئی خاص لطافت اور بلندی پیدا نہ ہوتی۔

ذوقِ جستجو خود ایک حجاب ہے چنانچہ انسان ایک راز کھولنے کی کوشش کرتا ہے تو دوسرا راز سامنے آجاتا ہے۔ غرض جب تک وہ اس جد و جہد میں مصروف رہتا ہے حقیقت اس کی نگاہوں سے مخفی رہتی ہے لیکن جب اُس پر بیخودی طاری ہو جاتی ہے تو یہ حجاب جستجو دفعتاً اٹھ جاتا ہے اور جمال حقیقت نظر آنے لگتا ہے ؎

جس پہ میری جستجو نے ڈال رکھے تھے حجاب
بیخودی نے اب اسے محسوس و عریاں کر دیا

اسی خیال کو ایک دوسری جگہ نہایت لطیف پیرائے میں ادا کیا ہے ؎

خستگی نے کر دیا اس کو رگِ جاں کے قریب
جستجو ظالم کہے جاتی تھی منزل دُور ہے

حُسن ایک غیر محدود شے ہے جس کی تجلّی جہت و مقام کی بندشوں سے آزاد ہے اس لئے اس کا ذوق مشاہدہ متقاضی ہے کہ ظاہر و باطن کے قیود باقی نہ رہیں ؎

ہیچ حسنِ تعیّن سے ظاہر ہو کہ باطن ہو
یہ قید نظر کی ہے وہ فکر کا زنداں ہے

اکثر انسان میں مخصوص صلاحیتیں ہوتی ہیں، جو مخفی اور غیر محسوس ہوتی ہیں، لیکن جب کوئی خارجی اثر محرک ہوتا ہے تو وہ دفعتہً چمک اٹھتی ہیں، دیکھو اس نکتہ کو کس شاعرانہ انداز کے ساتھ ادا کرتے ہیں ؎

ایسا بھی ایک جلوہ تھا اس میں چھپا ہوا
اُس رخ پہ دیکھتا ہوں اب اپنی نظر کو میں

یعنی جب تک رخ رنگیں کے پرتو سے نظر فیضیاب نہیں ہوئی تھی، اس وقت تک اُس کی معجز نمائیوں کا احساس نہ تھا۔

ایک ہی ہستی مختلف مقامات پر استعداد محل کے اعتبار سے مختلف ناموں سے تعبیر کی جاتی ہے ؎

کہیں ہے عشق کہیں ہے کشش کہیں حرکت
بھرا ہے خامۂ فطرت میں رنگِ فتنہ گری

غور کرو ثانی مصرع کی طرزِ ادا نے شعر میں کس قدر لطافت اور دلآویزی پیدا کردی ہے کائنات اور اس کے مظاہر عدم محض ہیں، حقیقی وجود صرف جمال الٰہی کا ہے بقیہ جو کچھ نظر آتا ہے سب اُسی کا عکس ہے۔ فی نفسہٖ اس کی کوئی حقیقت نہیں اس لطیف نکتہ کو حضرت اصغر ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں ؎

اک قطرۂ شبنم پر خورشید ہے عکس آرا
یہ نیستی و ہستی افسانہ ہے افسانہ

دیکھو قطرۂ شبنم کی ترکیب نے علاوہ شعریت کے "عدم محض" کی تخیل کو کس خوبی کے ساتھ نمایاں کر دیا ہے۔

مستقل جلوہ صرف ذاتِ مطلق کا ہے۔ بقیہ مشاہد و مناظر صفات کی نیرنگیوں کے کرشمے ہیں ؎

تو شمع حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے
فانوس کی گردش سے کیا کیا نظر آتا ہے

ان اشعار سے تم بخوبی اندازہ کر سکتے ہو کہ حضرت اصغر کی نکتہ رس نگاہ اسرار و معارف کی کس حد تک اداشناس ہے؟ اس قسم کے اکثر اشعار اس مجموعہ میں موجود ہیں جس سے اُن کے کلام کی معنوی لطافت ریزیوں کا کافی طور پر اندازہ ہوتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ طوالت کے لحاظ سے اُن کو قلم انداز کرنا پڑتا ہے۔

لطافتِ خیال حضرت اصغر کی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت خیالات کی پاکیزگی اور اندازِ بیان کی لطافت اور جدّت ہے۔ وہ ہمیشہ بلند اور لطیف جذبات واحساسات کی مصوری کرتے ہیں۔ جہاں تک عام نگاہیں پہونچنے سے قاصر ہیں، چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ عام خیال ہے کہ عاشق کی وارفتگی و سرمستی جلوۂ حسُن کے دیدار کا فیض اثر ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ادائے حسُن کا نظارہ ناممکن ہے، کیونکہ جب ہوش ہی قائم نہیں رہتا تو شعاعِ جمال کی جلوہ ریزیوں سے کوئی کیونکر کیف اندوز ہو سکتا ہے جو کچھ دل و دماغ پر سرمستانہ کیفیت طاری ہے، وہ صرف عشق ہی کی تاثیر کا نتیجہ ہے، اس لطیف نکتہ کو اِن الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ ؎

سب ہے ادائے بیخودی ورنہ ادائے حسُن کیا
ہوش کا جب گزر نہیں اُس کی صریح نازیں

چشمِ ساقی کے اشاروں پر مختلف طریقوں سے طبع آزمائیاں کی گئی ہیں، لیکن جس کی لطافت تک حضرت اصغر کی نکتہ رس نگاہ پہونچی ہے۔ اس کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے ؎

بہت لطفِ اشارے تھے چشمِ ساقی کے
نہیں ہوا کبھی بے خود نہ ہوشیار ہوا

کیا اِس سے زیادہ اور کوئی لطیف پہلو دماغ میں آ سکتا ہے ؟ ۔

گریباں محض وحشت کا پردہ نہیں ہے، بلکہ خود حسن کا پردۂ راز ہے۔ جس کا چاک کرنا گویا خود لیلائے حسن کو بے نقاب کرنا ہے اِس لئے گریبان چاک ہوتے وقت ایک نکتہ رس عاشق کا دل کانپ اُٹھتا ہے کہ یہ حقیقت میں خود حسن کی پردہ دری ہے ۔

غضب ہوا کہ گریباں ہے چاک ہونے کو
تمھارے حسن کی ہوتی ہے آج پردہ دری

یاس وناامیدی عام شعراء کے لئے پیام موت ہے، لیکن اہلِ نظر کے لئے یہی سرمایہ حیات ہے کیونکہ یاس وناکامی کے ساتھ جلوۂ محبوب کی جھلک بھی پیشِ نظر رہتی ہے، اس لطیف نکتہ کو حضرت اصغر یوں اَدا کرتے ہیں ۔

سرمایۂ حیات ہے حرمانِ عاشقی
ہے ساتھ ایک صورتِ زیبا لئے ہوئے

حسنِ یار کی تجلّی اگر کرمفرما نہ ہو، تو نگاہِ شوق میں ذوقِ مشاہدہ کی استعداد پیدا نہیں ہو سکتی ۔

نگاہِ یار کو اب سیرِ دید نہ ہو
جو ساتھ ساتھ تجلّی حسنِ یار نہ ہو

حسن دراصل کوئی مستقل وجود نہیں، صرف نگاہِ شوق کی رنگینیوں کا پرتو جمال ہے ۔

ستم جو چاہے کرے مجھ پہ عکسِ ذوقِ نظر
بساطِ آئینۂ حسنِ خود نما معلوم

زندگی صرف ذوقِ طلب اور اضطرابِ پیہم کا نام ہے اس لئے ایک زندہ روح کو سکونِ وصل میں کوئی لطف محسوس نہیں ہو سکتا ؎

آغوش میں ساحل کے کیا لطفِ سکوں اس کو
یہ جان ازل ہی سے پروردۂ طوفاں ہے

عشق کی ناکامیاں دراصل زندگی کا حاصل ہیں، اس لئے زندگی کا جو حصہ ناکامیوں میں گزرتا ہے، وہ بیکار نہیں ہوتا ؎

سارا حصول عشق کی ناکامیوں میں ہے
جو عمر رائیگاں ہے وہی رائیگاں نہیں

حسن خود عشق سے ہم آغوش ہونے کے لئے مضطرب ہے ورنہ خود عشق میں اتنی بلند پروازی کہاں کہ وہ حریمِ حسن میں باریاب ہو سکے ؎

شعاعِ مہر خود بیتاب ہے جذبِ محبت سے
حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ شبنم کی

عام مذاق کے نزدیک درد وغم کا مقصود وصلِ محبوب ہے لیکن ایک بیدار دل کے لئے درد وغم کا حاصل صرف اس کی ابدی لذّت ہے۔ اس لئے وہ تاثیر آہ کا متلاشی نہیں وہ صرف آہ اس لئے کرتا ہے کہ خود اس میں ایک کیف پنہاں ہے ؎

بہائے درد والم درد وغم کی لذّت ہے
وہ ننگِ عشق ہے جو آہ ہو اثر کے لئے

ان اشعار سے تم کافی طور پر اندازہ کر سکتے ہو کہ حضرت اصغر کے دل و دماغ میں کسی حد تک لطافت اور پاکیزگی کا عنصر موجود ہے اس قسم کے اور لطیف اشعار بھی بکثرت

حضرت اصغر کے کلام میں موجود ہیں، لیکن طوالت کے لحاظ سے اُن کو قلم انداز کرنا پڑتا ہے چند اشعار اور ملاحظہ ہوں ؎

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا — جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

بھر گئی آنکھوں کے نیچے وہ ادائے برقِ حسن — چیخ اُٹھے سب مرا چاکِ گریباں دیکھ کر

رکھ دیئے دیر و حرم سرمائے کے واسطے — بندگی کو بے نیازِ کفر و ایماں کر دیا

چاہا جہاں سے منظرِ فطرت بدل دیا — ہے کُل جہان تابعِ فرمانِ آرزو

ندرت ادا لطافتِ خیال کے علاوہ ایک کامل الفن شاعر کے لئے اندازِ بیان کی ندرت اور جدّت نہایت ضروری چیز ہے بغیر اِس کے اِس کی تمام جدّت طرازیاں بالکل بیکار ہیں، جو شعر بلاغت شناس ہوتے ہیں، وہ ہمیشہ ایسا دلآویز پیرایۂ بیان اختیار کرتے ہیں جس کی وجہ سے معمولی سا معمولی خیال بھی دلکش بن جاتا ہے حضرت اصغر تاثیرِ شعری کے اِس رمزِ لطیف سے بخوبی واقف ہیں، اس لئے وہ ہمیشہ طرزِ ادا کی ندرت کا خاص خیال رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ معمولی بات بھی کہتے ہیں تو اس انداز سے کہ سننے والا وجد کرنے لگتا ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں آرزوئے دید کی وارفتگی کا مختلف طریقوں سے اظہار کیا گیا ہے اور ہمارے شعراء کا عام موضوعِ سخن ہے لیکن دیکھو حضرت اصغر نے پامال جذبہ کو کس پُرکیف انداز کے

ساتھ ادا کرتے ہیں ؎

تو برق حسن اور تجلّی سے یہ گریز
میں خاک اور ذوقِ تماشا لئے ہوئے

حسن یار کے اشارہ ہائے چشم و ابرو پر دیدۂ دل کا نثار کرنا ہمارے شعراء کا شیوہ عام ہے جو اکثر ابتذال کی حد تک پہونچ جاتا ہے لیکن حضرت اصغر کی لطافتِ ادا نے اس خیال میں جو نزاکت پیدا کر دی ہے وہ اُن کے ندرتِ بیان کی ایک روشن مثال ہے ملاحظہ ہو ؎

مری نگاہوں نے جھک جھک کے کر دیے سجدے
جہاں جہاں سے تقاضائے حسنِ یار ہوا

جہاں جہاں کے ٹکڑے نے شعر میں جو لطیف اور بلیغ پہلو پیدا کر دیا ہے، وہ محتاجِ اظہار نہیں۔ معشوق کے جلوؤں کی معجز طرازیوں کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں ؎

بہ تو رُخ کے کرشمے تھے سرِ راہگذر
ذرّے جو خاک کے اُٹھے وہ صنم خانہ بنے

محبوب کے نقشِ پا کی شوخی و رعنائی کی کیفیت، کو اس دلکش پیرائے میں ادا کرتے ہیں ؎

اِس سے زیادہ اور کیا شوخیٔ نقشِ پا کہوں
برق سی اک چمک گئی آج سرِ نیاز میں

اس قسم کے اشعار بکثرت حضرت اصغر کے کلام میں موجود ہیں جس سے کافی طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک اندازِ بیان میں لطافت اور ندرت پیدا کر سکتے ہیں

افسوس ہے کہ ہم طوالت کے لحاظ سے ان پر تفصیلی نظر نہیں ڈال سکتے۔ حضرت اصغر کے حسنِ ادا کا خاص راز اُن کا ذوقِ فارسیت ہے غزل کی زبان اگرچہ جہاں تک ممکن ہو سادہ، شیریں اور تکلف سے خالی ہونی چاہیئے، تاہم ایک لطیف طبع شاعر فارسی ترکیبوں کی نزاکت کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ لیکن اس موقع پر اس کا لحاظ رکھنا چاہیئے کہ جو فارسی ترکیبیں استعمال کی جائیں وہ شاعرانہ رنگینی اور نزاکت سے خالی نہ ہوں۔ ورنہ کلام میں ثقالت اور پستی آ جائے گی۔ حضرت اصغر فارسی ترکیبوں کے خاص طور پر دلدادہ ہیں۔ لیکن چونکہ نکتہ سنج ہیں۔ اس لئے ایسی لطیف ترکیبیں استعمال کرتے ہیں جن سے شعر میں ایک خاص رعنائی اور دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً

جو مجھ پہ گذری ہے شب بھر وہ دیکھ لے ہمدم
چمک رہا ہے مژہ پر ستارۂ سحری

ستارۂ سحری سے قطرۂ اشک کی تشبیہ کس قدر لطافت میں ڈوبی ہوئی ہے۔

پھر دل میں التفات ہوا اُن کے جا گزیں ‏ ‏ ‏ ‏ اک طرزِ خاص رنجشِ بے جا لئے ہوئے

کرم کچھ آج ہے ساقی کا وہ طرب انگیز ‏ ‏ ‏ ‏ کہ جرعہ جرعہ ہے موجِ ترنمِ سحری

اس جوئبارِ حسن سے سیراب ہے فضا ‏ ‏ ‏ ‏ رو کو نہ اپنی لغزشِ مستانہ وار کو

ہجومِ غم میں نہیں کوئی تیرہ بختوں کا ‏ ‏ ‏ ‏ کہاں ہے آج تو اے آفتابِ نیم شبی

بلبلِ راز سے گو صحنِ چمن چھوٹ گیا ‏ ‏ ‏ ‏ اس کے سینے میں ہے اک شعلۂ گلفام ابھی

قلب پر اب تک تڑپتی ہے شعاعِ برقِ طور — خون کے قطروں میں اب تک رقص منصور ہی بھی ہے

اک شورشِ بے حاصل اک آتشِ بے پروا — آتشکدۂ دل میں اب کفر ہے نہ ایماں

جانِ بلبل کا خزاں میں نہیں پرساں کوئی — اب چمن میں نہ رہا شعلۂ عریاں، کوئی

دل جلوہ گاہِ حسن بنا فیضِ عشق سے — وہ داغ ہے کہ شاہدِ رعنا کہیں جسے

اکثر رہا ہے حسنِ حقیقت بھی سامنے — اک مستقل سراب تمنا کہیں جسے

خط کشیدہ ترکیبوں پر غور کرو، کس قدر شاعرانہ رنگینی اور نزاکت سے معمور ہیں بلکہ وہی شعر کی جان ہیں، چنانچہ یہ ترکیبیں اگر نکال دی جائیں تو شعر کی تمام لطافت برباد ہو جاتی ہے، اس قسم کی ترکیبیں تم کو اکثر حضرت اصغر کے کلام میں ملیں گی جن سے شعر کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

صفائی و برجستگی | اگرچہ حضرت اصغر پر ذوقِ فارسیت بہت زیادہ غالب ہے تاہم اُن کی زبان میں ایک خاص قسم کی صفائی اور برجستگی پائی جاتی ہے یہ محض ایک ذوقی چیز ہے جس کا اندازہ مثالوں سے ہو سکتا ہے بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

موجِ نسیمِ صبح کے قربان جائیے — آئی ہے بوئے زلف معنبر لئے ہوئے

پہلی نظر بھی آپ کی اُف کس بلا کی تھی — ہم آج تک وہ چوٹ ہیں دل پر لئے ہوئے

رند جو ظرف اُٹھا لیں وہی ساغر بن جائے — جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

تقدیر کس کے خرمنِ ہستی کی کھُل گئی — طوفان بجلیوں کا تمھاری نظر میں ہے

آئے تھے سبھی طرح کے جلوے مرے آگے — میں نے مگر اے دیدۂ حیراں نہیں دیکھا

ہر اک جگہ تری برقِ نگاہ دوڑ گئی — غرض یہ ہے کہ کسی چیز کو قرار نہ ہو

اس کی نگاہِ ناز نے چھیڑا کچھ اس طرح   ابتک اُچھل رہی ہے رگِ جانِ آرزو

دیکھو سادگی اور برجستگی کے ساتھ ان اشعار میں ایک خاص کیفیت بھی موجود ہے۔

جوش و سرمستی حضرت اصغرؔ کی شاعری کی ایک دوسری امتیازی خصوصیت جوش و مستی ہے جس نے اُن کو تمام معاصرین سے علانیہ ممتاز کر دیا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ جہاں تک جوش، رقص، اور مستی کا تعلق ہے۔ حضرت اصغرؔ کو بجا طور پر اردو کا حافظ کہا جا سکتا ہے، حضرت اصغرؔ فطرۃً نہایت شگفتہ مزاج اور رنگین واقع ہوئے ہیں علاوہ اس کے بادۂ تصوّف کا نشہ بھی سر میں ہے اس لئے اُن کی ایک ایک ادا جوشِ محبّت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ یاس و حسرت آہ و بُکا، گریہ و زاری۔ فریاد و ماتم کے پست اور بزدلانہ جذبات سے اُن کا نشاط آفریں دل و دماغ قطعاً نا آشنا ہے وہ اپنے پہلو میں ایک زندہ اور بیدار دل رکھتے ہیں جو سرتاپا نشاطِ حیات سے مخمور ہے اس لئے ان کی زبان سے جو حرف نکلتا ہے کیف و سرور سے لبریز ہوتا ہے اس کا اندازہ ذیل کے اشعار سے ہو سکتا ہے ؎

سرشکِ شوق کا وہ ایک قطرۂ ناچیز   اُچھالنا تھا کہ اک بحرِ بے کنار ہوا

بیخود و محو جسم و جاں مست زمین و آسماں   حسن نے دستِ ناز سے چھیڑ دیا ہے سازِ عشق

انوار کی ریزش ہو اسرار کی بارش ہو   ساغر کو جو ٹکرا دوں اس گنبدِ مینا سے

سرمستیوں میں شیشۂ مئے لے کے ہاتھ میں   اتنا اُچھال دیں کہ ثریا کہیں جسے

ہے ترے تصوّر سے یہاں نور کی بارش   یہ جانِ حزیں ہے کہ شبستانِ حرا ہے

مانا حریمِ ناز کا پایا بلند ہے   لے جائے گا اُچھال کے دردِ جگر مجھے

وہ عشق کی عظمت سے شاید نہیں واقف ہیں   سو حسن کروں پیدا ایک ایک تمنا سے

نہیں معلوم یہاں دار و رسن ہے کہ نہیں — خون میں گرمیٔ ہنگامۂ منصور ہے آج

یہ دین، وہ دنیا ہے، یہ کعبہ وہ بت خانہ — ایک اور قدم بڑھ کر اے ہمتِ مردانہ

کچھ صبحِ ازل کی نہ خبر شامِ ابد کی — بے خود ہوں تہِ سایۂ دامانِ محمدؐ

اب اُس نگاہِ ناز سے ربطِ لطیف ہے — مجھ کو دماغ صحبتِ روحانیاں نہیں

بیدار ہوا منظر اس مست خرامی سے — غنچوں کی کھلی آنکھیں دامن کی ہوا آئی

نام اُن کا آگیا کہیں ہنگامِ بازپرس — ہم تھے کہ اُڑ گئے صفِ محشر لیے ہوئے

کچھ اس انداز سے چھیڑا تھا میں نے نغمۂ رنگیں — کہ فرطِ شوق سے جھومی ہے شاخِ آشیاں برسوں

ان اشعار کو پڑھو! معلوم ہوتا ہے کہ ایک رندِ سرمست ہے جس کو زمین سے آسمان تک جوشِ مسرت سے بریز نظر آتا ہے اس قسم کے اور بھی اشعار حضرت اصغرؔ کے کلام میں موجود ہیں جن سے اُن کے ولولۂ محبت کی سرمستیوں کا کافی طور پر اندازہ ہوتا ہے لیکن طوالت کے خوف سے ہم اُن کو قلم انداز کرتے ہیں۔

اُردو کا تغزل باوجود گوناگوں اوصاف کے ابتک رقص و مستی کی کیفیت سے ناآشنا تھا، یعنی اب تک عام طور پر یاس و حسرت، فریاد و ماتم، آہ و فغاں وغیرہ بے کیف اور ولولہ شکن جذبات ادا کئے جاتے تھے۔ کیف و سرور کا عنصر تقریباً مفقود تھا، موجودہ زمانہ میں یہ فخر صرف حضرت اصغرؔ کو حاصل ہے کہ اُن کی سحر طرازیوں نے غزل کے قدیم قالب بے جان میں رقص و مستی کی ایک جدید رُوح پھونکدی اور لوگوں کو نظر آگیا کہ تغزل اگر فی الواقع تغزل ہے وہ کس حد تک مضطرب قلوب کو متاثر کرسکتا ہے عشق نشاطِ رُوح کا سرچشمہ ہے اِس لئے غزل میں جوشِ محبت کی رنگینیوں کا آئینہ ہے، بجز بلند، لطیف اور آتش فشاں جذبات کے فرد و ماتم

یاس و غم کی گنجائش نہیں ہو سکتی، چنانچہ حضرت اصغر خود فرماتے ہیں اور صحیح فرماتے ہیں ؎

غزل کیا اک شرارِ معنوی گردش میں ہے اصغر
یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کا

پھر فرماتے ہیں ؎

شعر میں رنگینیٔ جوشِ تخیل چاہیئے
مجھ کو اصغر کم ہے عادت نالہ و فریاد کی

ایک شخص جس کو قدرت کی طرف سے احساسِ لطیف عطا ہوا ہے جس کے دل و دماغ پر نشاط محبت کی رنگینیاں چھائی ہوئی ہیں انصاف یہ ہے، کہ فریاد و ماتم اس کے بس کی بات نہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ اب اس شیوۂ کہن میں کوئی لطافت بھی نہیں رہی طبیعتیں افسردہ ہیں اس لیئے اِن کو مشتعل کرنے کے لئے اب برف پاشی کی ضرورت ہے چنانچہ حضرت اصغر اس آہ و فغاں سے تنگ آ کر کہتے ہیں ؎

فروغِ آرزو ہو نغمۂ خاموشِ الفت میں
یہ کیا اک شیوۂ فرسودۂ آہ و فغاں برسوں

کیا ہمارے شعراء کے قدیم ماتم کدوں سے اس نعرۂ مستانہ پر کوئی صدائے لبیک بلند ہو سکتی ہے ؎

لالہ و گل پہ جو ہے قطرۂ شبنم کی بہار — رُخِ رنگیں پہ جو آئے تو حیا ہو جائے
رُخِ رنگین پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی — شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی
نہ شاید مرے سوا کوئی اس کو سمجھ سکے — وہ ربطِ خاص رنجشِ بیجا کہیں جسے

اس عارضِ رنگیں پہ عالم وہ نگاہوں کا — معلوم یہ ہوتا ہے پھولوں میں صبا آئی

پھر اُن لبوں پہ موجِ تبسم ہوئی عیاں — سامانِ جوشِ رقص تمنّا لئے ہوئے

جن اشعار کی لطافت الفاظ کے بارِ گراں کی متحمل نہیں ہو سکتی اُس کا اندازہ صرف ذوقِ صحیح کر سکتا ہے ۔

زاہد نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا — رُخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا

عارضِ نازک پہ اُن کے رنگ سا کچھ آگیا — ان گلوں کو چھیڑ کر ہم نے گلستاں کر دیا

بکھری ہوئی ہے زلف بھی اِس چشمِ مست پر — ہلکا سا ابر بھی سرِ میخانہ دیکھئے

پھر آج بزمِ عیش میں آئے جنابِ شیخ — وحشت نوائی غمِ فردا لئے ہوئے

دیکھو اس موقع پر بھی حضرت اصغر لطافت اور سنجیدگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے

سوز و گداز | غزل کی ایک خاص خصوصیت سوز و گداز ہے جس کے بغیر شعر میں تاثیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن سوز و گداز آہ و بکا کا نام نہیں جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے سمجھ رکھا ہے بلکہ دل کی ایک لطیف دردمندانہ کیفیت کا نام ہے جس کے اثر سے شاعر کا ایک ایک حرف لبریز ہوتا ہے اس حیثیت سے حضرت اصغر کا اس وقت کوئی حریف نہیں۔ چونکہ علاوہ ایک نکتہ رس اور بلاغت شناس شاعر ہونے کے ذوقِ تصوف کے بھی لذت شناس ہیں اس لئے ان کا سینہ سوز و گداز، درد و نیاز کا آتشکدہ ہے، چنانچہ خود کہتے ہیں اور صحیح کہتے ہیں ۔

میں سراپا ہوں تمنّا ہمہ تن درد ہوں میں

ہر بُنِ مو میں تڑپتا ہے مرے دل میرا

حقیقت یہ ہے کہ حضرت اصغر عشق و محبت کی ایک ایک منزل سے عملاً واقف

ہیں اس لئے وہ جن کیفیات کو ادا کرتے ہیں وہ خود اُن کے درد آشنا قلب پر طاری ہوتی رہتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان سے جو حرف نکلتا ہے تاثیر میں ڈوبا ہوتا ہے، لیکن سوز و گداز میں بھی حضرت اصغرؔ نے اپنی امتیازی خصوصیت کی شان قائم رکھی ہے یعنی محض درد ہی درد نہیں ہے، بلکہ اس میں ذوق محبت کی رنگینیاں بھی بھر دی ہیں اور انصاف یہ ہے کہ جس رنگینی کے ساتھ حضرت اصغرؔ نے پُر گداز جذبات ادا کئے ہیں اس کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

غزل میں دردِ رنگیں تو نے اصغرؔ بھر دیا ایسا
کہ اس میدان میں سوتے رہیں گے نوحہ خواں برسوں

یہ صرف شاعرانہ تعلی نہیں ہے بلکہ صاحب ذوق صاف طور پر محسوس کر سکتا ہے کہ حضرت اصغرؔ نے تغزل کو شور و فغاں، فریاد و ماتم کی مبتذل اداؤں سے پاک کر کے اس کو کس حد تک نشاط درد کی رنگینیوں سے معمور کر دیا ہے سوز و گداز درحقیقت ایک ذوقی چیز ہے جس کا احساس وجدانِ سلیم سے وابستہ ہے۔ حضرت اصغرؔ کا کلام اگرچہ سرتاپا گدازِ عشق کی لطیف کیفیت سے لبریز ہے تاہم چند مثالیں ملاحظہ ہوں جن سے ایک حد تک اندازہ ہوگا کہ وہ پُر درد جذبات بھی کس رنگین انداز کے ساتھ ادا کر سکتے ہیں ؎

اس طرح پھونکا کہ آخر جسم کو جاں کر دیا
تو نے یہ اعجاز کیا اے سوزِ پنہاں کر دیا

اب جنبشِ نظر میں کوئی داستاں نہیں
مدت ہوئی ہے چشمِ تحیر کو ہے سکوت

ایسا سکوت ہے کہ تقاضا کہیں جسے
میری فغانِ درد پہ اُس سروِ ناز کو

دیکھو معشوق کی جفاکشی کو کس لطیف پیرائے میں ظاہر کیا ہے ؎

دل میں اک بوند لہو کی نہیں رونا کیسا
اَب ٹپکتا نہیں آنکھوں سے گلستاں کوئی

غور کرو کس قدر رنگین پیرایۂ بیان ہے ؎

رَوانی رنگ لائی دیدۂ خونناب افشاں کی
اُتر آئی ہے اک تصویر دامن پر گلستاں کی

صریح قدس میں کیا لفظ و معنی کا گذر
پھر بھی سب باتیں پہنچتی ہیں لبِ فریاد کی

نغمۂ پُر درد چھیڑا میں نے اس انداز سے
خود بخود مجھ پر نظر پڑنے لگی صیاد کی

دل ہوا مجبور جس دم اشک حسرت بن گیا
روح جب تڑپی تو صورت بن گئی فریاد کی

مجھ کو نہیں تاب خلشہائے روزگار
دل ہے نزاکتِ غمِ لیلا لئے ہوئے

اُفتادگانِ عشق نے سر اُٹھا کر رکھ دیا
اُٹھیں گے بھی تو نقشِ کفِ پا لئے ہوئے

محبت کی وارفتگی کی کتنی پُر کیف مصوری ہے ؎

اک شعلہ اور شمع سے بڑھ کر ہے رقص میں
تم چیز کر تو سینۂ پروانہ دیکھتے

سجدۂ شوق کی بیقرارانہ کیفیت کو ان الفاظ میں اَدا کرتے ہیں ؎

کیجیے آج کس طرح دوڑ کے سجدۂ نیاز
یہ بھی تو ہوش اب نہیں پاؤں کہاں ہے سر کہاں

خاک پروانے کی برباد نہ کر بادِ صبا
یہی ممکن ہے کہ کل تک میرا افسانہ بنے

مجھ کو جلا کے گلشنِ ہستی نہ پھونکدے
وہ آگ جو دبی ہوئی مشتِ پر میں ہے

میں کیا کہوں کہاں ہے محبت کہاں نہیں
رگ رگ میں دوڑی پھرتی ہے نشتر لئے ہوئے

خاک پروانہ پر شعراء عام طور پر اشک حسرت بہا کر رہ جاتے ہیں، لیکن

حضرت اصغر کی پُر گداز نگاہوں کو اسی خاکِ ناچیز کے ذرّوں میں جمالِ شرحِ شبستان کی تجلّی رقص کرتی ہوئی نظر آتی ہے ؎

انداز ہیں جذب اِس میں سب شمع شبستاں کے
اک حُسن کی دُنیا ہے خاکسترِ پروانہ

اس شعر کی نزاکت ادا پر ذوقِ رنگین جس قدر ناز کرے بجا ہے، اس قسم کے پُر گداز اشعار اکثر حضرت اصغر کے کلام میں موجود ہیں، جن کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وادئی ایمن میں شرر باریاں ہو رہی ہیں، افسوس ہے کہ طوالت کے لحاظ سے ہم حضرت اصغر کے کلام پر اس شرح و تفصیل کے ساتھ نقد و بحث نہ کر سکے جس کا دراصل وہ مستحق تھا اور نہ عدیم الفرصتی کی وجہ سے ہم کو غور و فکر کا کافی موقع مِل سکا، تاہم اس مختصر اظہارِ خیال سے اربابِ ذوق کافی اندازہ کر سکتے ہیں کہ حضرت اصغر شاعرانہ حیثیت سے کس حد تک عظمت و احترام کے مستحق ہیں۔ میرا یہ دعویٰ نہیں کہ حضرت اصغر کا کلام فرو گذاشتوں سے بالکل منزہ ہے۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اُن کی لطافت آفرینیوں نے تغزل کے اندازِ قدیم میں رقص و سرور کا ایک نیا عالم پیدا کر دیا ہے، جو اب تک نگاہوں سے مخفی تھا حضرت اصغر نہ کسی خاص صنفِ سخن کے موجد ہیں اور نہ وہ دنیا میں کوئی پیام لے کر آئے ہیں اور نہ اُن کی لطافتِ رُوحانی مادیت کے گیر و دار کی متحمل ہو سکتی ہے، اُن کی نگاہیں صرف اِسی عالمِ قدس کے رُوح پرور مناظر کی ادا شناس ہیں، جہاں بجز ایک لازوال تاثر، ایک رُوح نواز ترنّم، ایک ابدی لذّت، ایک جاں فروز تجلّی، ایک نشاط آفریں رقص، ایک دلگداز ذوق، ایک آتش فشاں

وجد کے سوا اور کوئی سماں نظر نہیں آتا، اس لئے موجودہ مذاق جو عالمِ مادی کے حوادث و افکار کی مُرقع نگاری کا دلدادہ ہے، ممکن ہے کہ حضرت اصغرؔ کی اس لغزشِ مستانہ کے خیر مقدم کے لئے تیار نہ ہو۔ لیکن ذوقِ لطیف عشق و محبت کے اِن اسرارِ رنگین پر جو درحقیقت صحیفۂ شاعری کے ابدی نقوش ہیں بغیر وجد کئے ہوئے نہیں رہ سکتا۔

تبصرہ نشاطِ روح

(مولوی اقبال احمد خاں صاحب سہیل ایم، اے، ال، ال، بی)

نقد و تبصرہ اور وہ بھی فنونِ لطیفہ کے متعلق بجائے خود صحتِ ذوق کے علاوہ بہت کچھ دقتِ نظر اور وسعتِ معلومات کا محتاج ہے۔ تاثیر و تنقید دو مختلف شعبے ہیں جو ایک دوسرے سے مراحل دُور ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ ایک نغمۂ دلکش میری روح پر رقصِ پیہم کی کیفیت پیدا کر دے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس نغمہ کی تاثیر اور میری رُوح کی تاثیر میں جو ربط معنوی ہے اس پر میں حکیمانہ اور فلسفیانہ نظر بھی رکھتا ہوں یا اس کے محض اسباب و علل کو الفاظ میں ظاہر کرنے پر بھی قادر ہوں، شاعری حقیقت میں حسن و مجرد کی اس مصوری کو کہتے ہیں جس میں لطیف موسیقی بھی شامل ہو اور جب آج تک حسن صمدی کی تمام اداؤں اور نغمۂ مادی کی تمام کیفیات کے لئے زبان میں الفاظ نہیں ملتے اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ "بسیار شیوہاست بتاں را کہ نام نیست" تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ حسن معنوی اور نغمۂ روحانی یعنی شاعری جیسی ذوقی اور وجدانی چیز کے نسبت ہماری کیفیاتِ نفسی کی تعبیر الفاظ میں کی جا سکے اور وہ بھی جناب اصغر

کی شاعری جس کا ایک ایک حرف کمال شاعری کا دلکش مُرقع ہے اس کی نسبت ناقدانہ حیثیت سے کچھ کہنا آسان کام نہیں ہے، مجھ میں اس قدر بصیرت نہیں ہے کہ میں اُن کے کلام پر شایانِ شان تبصرہ کرسکوں مجھ کو بلا کسرِ نفس اپنی بے بضاعتی کا اعتراف ہے اور اس اعتراف حقیقت کو اپنے صحتِ ذوق کی دلیل سمجھتا ہوں۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ حریم محبت کے آداب دنیا کے عام رسم و آئین سے بالکل مختلف ہیں اور یہاں کسی ہدیہ نیاز کی گرانمائیگی ارزش متاع پر منحصر نہیں ہے بلکہ محض خلوص ہدیہ معیار ردّ و قبول ہے، اس بنا پر جن خیالات کا اظہار سطور ذیل میں کیا گیا ہے وہ آستانہ محبت پر محض ایک نذر اخلاص ہے۔

قبل اس کے کہ جنابِ اصغرؔ کے کلام پر کچھ گذارش کی جائے یہ ضروری ہے کہ نفس شاعری پر اجمالی حیثیت سے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا جائے۔ ممکن ہے کہ بعض اربابِ نظر میرے ہم آہنگ نہ ہوں لیکن کم سے کم میرا زاویہ نگاہ نکتہ سنجوں کے پیشِ نظر ہو جائے گا اور آئندہ مجھے تصحیح خیال کا موقع ہوگا، فنونِ لطیفہ کی تقسیم چہارگانہ میں شاعری مسلّم طور پر سب سے بلند تر ہے۔ اس کی وجہ محض اسقدر ہے کہ شاعری بقیہ اصناف کی جامع محاسن ہے، اس کے علاوہ شاعری کے قلمرو میں حقائق و معارف اسرار و حُکم کی غیر فانی دنیا شامل ہے جہاں مصوری و موسیقی کو کوئی دسترس نہیں، مصوّر کا قلم صرف انھیں کیفیات نفسی کی تصویر کھینچ سکتا ہے جس کا اظہار عوارضِ جسمانی سے ممکن ہے لیکن شاعر کی نگاہِ نفس انسانی کی اُن گہرائیوں تک پہونچی ہے جہاں کیفیت و کم کی گنجائش نہیں ہے۔ ایک بُت تراش کی تخیل ابعاد ثلاثہ کے حدود سے متجاوز نہیں ہو سکتی مگر ایک شاعر کا تخیل عالم قدس تک پرواز کرتا ہے اور یہ نشہ بے کیف اور معنی بے صحت کو پیکر خیالی دے کر آپ کے پیشِ نظر کر سکتا ہے۔ ایک مغنی اپنے ترانہ جان نواز سے صرف

رُوح میں انبساط پیدا کرسکتا ہے مگر ایک شاعر اپنے ترنم سے نفس ناطقہ پر بھی عالم وجد وحال طاری کرنے کی قدرت رکھتا ہے، اگر اس نظریہ کو تسلیم کر لیا جائے تو شاعری کے عناصر حسب ذیل ہوں گے :۔

۱۔ موسیقی

۲۔ بُت تراشی یا ایجاد و تخلیق۔

۳۔ مصوری

۴۔ اسرار و معارف

اگر شاعری ان ارکان اربعہ کی جامع ہے تو یہ معراج شاعری ہے لیکن کم سے کم ایک دو صفات لازمی ہیں ورنہ وہ شاعری نہیں کوئی اور چیز ہے۔

موسیقی | اصطلاح شاعری میں موسیقی اس کا نام ہے کہ حسن کیفیت سے متاثر ہو کر شاعر کی زبان سے ایک شعر نکلتا ہے وہ اُن الفاظ میں ادا ہو جن کا تلفظ اور ترکیب باہمی اپنے نغمہ کے اعتبار سے معانی کی طرف رہبری کر سکے مثلاً مولانا حالیؔ نے جس موقع پر ہندوستان کو مخاطب کر کے یہ مصرع لکھا ہے ع

تو نے اے غارتگر اقوام وَ اکّالُ الاُمَم

وہاں " اکال الامم " کی جگہ پر مشکل سے کوئی دوسرا لفظ مل سکتا تھا جس کے تلفظ سے اسی قدر بھیانک اور ڈراؤنی تصویر متخیلہ کے سامنے، یا مثلاً من کی ہستم کہ تا ابد بزیم، اور کیستم من کی جاوداں مانتیم "، دونوں مصرعے باعتبار ترکیب نحوی صحیح ہیں، مگر انتخاب الفاظ اور شگفتگی ترکیب کی بنا پر دونوں میں جو بعد المشرقین ہے، اس کو ہر صاحب ذوق سمجھ سکتا ہے۔ رُوح کو نغمہ سے جو فطری مناسبت ہے اس سے کون

انکار کرسکتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ جن شعراء نے الفاظ کے انتخاب اور ان کی ترکیب میں موسیقی اور ذوق صحیح کا لحاظ رکھا ہے وہ زندۂ جاوید ہیں، دیوان حافظ کی اس عالمگیر اور ابدی مقبولیت کا راز کیا ہے۔ محض دروبست الفاظ اور شگفتگی ترکیب کا طلسم!! لیکن جہاں شاعری کے لئے یہ عنصر سب سے زیادہ ضروری ہے، وہاں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ یہ چیز محض ذوقی ہے، اگر ایک شاعر بد و فطرت سے وجدان صحیح اور استعداد لطافت پسندی لے کر نہیں آیا ہے تو سعیٔ اکتساب سے یہ بات حاصل نہیں ہو سکتی، اور نہ ذوقِ ادب کا یہ لطیف نکتہ منکر کو کسی استدلال سے منوایا جاسکتا ہے، نہ اس کے اصول و ضوابط مقرر کئے جاسکتے ہیں، البتہ استقرار چند باتیں یہاں گزارش کی جاسکتی ہیں،

انتخاب الفاظ انتخاب الفاظ میں اِن اُمور کا لحاظ ضروری ہے، نامانوس نہ ہوں، تلفظ میں دشواری نہ ہو، محل استعمال میں سوقیت نہ ہو، آواز کو معانی سے مناسبت ہو، اگر سامع پر خود تنفس اور کراہت کی کیفیت پیدا کرنا مقصود نہیں ہے تو ان اشیاء یا افعال کے نام نہ ہوں جس سے ذوقِ انسانی فطرتاً متنفّر ہے جس کا اظہار انسان کا ملکۂ حیا گوارا نہیں کرسکتا۔ اسی طرح علوم و فنون کی اصطلاحات یا اعضاء و جوارح کی تشریح بھی شاعر کی نزاکت گوارا نہیں کرسکتی۔ مثلاً میّت جنازہ ناف جذبات کشش نقل وغیرہ

ترکیب الفاظ (الف) الفاظ کی ترکیب باہمی میں اس اَمر کا لحاظ ضروری ہے کہ ان کی حرکات و آواز ایک طرف تو کلیتاً باہم متضاد نہ ہوں تاکہ تنافر نہ پیدا ہو اور دوسری جانب اس قدر یکسانی نہ ہو کہ لطف تنوع جاتا رہے۔ بلکہ پستی و بلندی، شُستگی و

گویائی، زور و نزاکت، رقت و جزالت اس توازن و تناسب کے ساتھ باہم گردست و گریبان ہوں کہ ایک کو دوسرے سے ممتاز کرنا دشوار ہو جائے جس طرح گلاب کی پنکھڑی میں یہ کہنا مشکل ہوتا ہے کہ کہاں رنگ ہلکا ہے اور کہاں سے شوخی شروع ہوتی ہے، تاکہ بندش میں چستی کے ساتھ ایک لطیف انبساط بھی پیدا ہو جائے اور شعر میں خرام جوئبار کی طرح ایک فطری مگر معتدل روانی آ جائے۔

(ب) حتی الوسع آغاز ثقیل لفظ سے نہ ہو اور خاتمہ کسی منقطع اور بھدی آواز پر نہ کیا جائے، مثلاً ع

لبِ گلبرگ کو موجِ صبا نے آ کے چھیڑا جب

اس مصرع کے آخر میں جب کا تلفظ ذوق سامعہ کو اسی قدر گراں گزرتا ہے جس طرح کہ رات کے سناٹے میں تالاب کے کسی اونچے کگارے سے کوئی کچھوا پانی میں آ رہے۔

(ج) حتی الوسع ترکیب میں ندرت ہو مگر شگفتگی اور لطافت ہاتھ سے نہ جائے آجکل بعض حضرات نے غالبؔ و اقبالؔ کی تقلید میں جو عربی و فارسی کی غلط اور بے معنی ترکیبیں، بے درک و بصیرت لکھنا شروع کر دی ہیں وہ اہلِ ذوق کے لئے بازاری محاوروں سے زیادہ نفرت انگیز ہیں۔

(د) محل استعمال ایسا نہ ہو کہ جس سے کوئی رکیک پہلو نکلتا ہو، کیونکہ اگرچہ براہ راست اس کا کوئی تعلق موسیقی سے نہیں ہے مگر نکتہ سنج طبائع پر گراں ہوتا ہے اور موسیقی کی حلاوت میں بہت کچھ کمی پیدا ہو جاتی ہے۔

(س) ہر حالت میں لطافت اور اعتدال صحیح کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے

یہ نہ ہو کہ زورِ بیان چیخ کی حد تک پہونچ جائے، شکوہ الفاظ طبل بلند بانگ کا مصداق بن جائے۔ متانت وسنجیدگی، خشکی و پژمردگی کی مترادف ہو جائے اور رنگین بیانی نسائیت اور عریانیِ خیال کا روپ بھرے، شعر کا خطاب شریف ترین انسانی جذبات سے ہوتا ہے، اس لئے شعر کی موسیقی سمجھا جاتا ہے، وہ شائستہ جماعت کے لئے موجبِ انبساط تو کیا ہو تنفس وانقباض کا باعث ہوتا ہے۔ یہاں پر ایک نکتہ اور قابل گذارش ہے کہ جس طرح موسیقی کے اصناف مختلف ہیں اسی طرح شعر کی موسیقیت بھی جدا ہوتی ہے۔ زمزمۂ نشاط اور نامۂ ماتم دونوں میں یکساں تاثیر کی قابلیت ہے مگر تاثیر سامع کی صلاحیت واستعداد پر مبنی ہے۔ البتہ چونکہ انسانی زندگی بجائے خود ایک داستان مصیبت ہے۔ اور فطرتِ انسانی طباع کو اسقدر دلچسپی نہیں ہے جتنی ترانۂ مسرت سے ہو سکتی ہے اور باعتبار نتائج بھی نوحۂ ماتم فطرتِ انسانی کے لئے چنداں مفید نہیں ہے۔ کشاکش حیات میں زندہ رہنے کے لئے ہم کو رجز خوانوں کی ضرورت ہے جو طبائع میں سعی وعمل کی روح پھونک سکیں۔ دیوان حافظ کے دلنواز ترانے اور شاہنامۂ فردوسی کی رجز خوانیاں آج کئی صدیاں گذر جانے کے بعد بھی اسی وجہ سے زندہ ہیں کہ خود ان میں زندگی کی روح تھی اور آہ و فغاں کی جگہ وجد وحال کی تعلیم ان کا مطمحِ نظر تھا۔

خدا کا شکر ہے کہ جناب اصغرؔ کی شاعری عام سطح سے بہت بلند ہے اور ان کے یہاں ڈوبی ہوئی نبضیں، پتھرائی ہوئی آنکھیں، اور عالم نزع کی ہچکیاں غرضکہ زندہ درگور شہر اور بد مذاقیاں کہیں بھی نہیں ہیں، ان کی شاعری رقصِ معانی کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے، آنسو کا ایک ناچیز قطرہ ان کے جوشِ طبیعت کے

فیض سے کبھی ستارۂ سحری بن کر چمک اُٹھتا ہے اور کبھی شوق کا بحرِ بے کنار بن جاتا ہے، اپنی شاعری کے متعلق خود ان کی تنقید بہترین تنقید ہے، فرماتے ہیں ؎

غزل کیا اک شرارِ معنوی گردش میں ہے اصغرؔ
یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

اصغرؔ نشاطِ رُوح کا اک کھل گیا چمن
جنبش ہوئی جو خامۂ رنگین نگار کو

اشعار یہ اصغرؔ کے ہے رقصِ رگِ جاں میں
اک موجِ نسیم آ گئی باغِ مصلیٰ میں

جناب اصغرؔ کا ہر شعر بجائے خود ایک نغمۂ پُر کیف ہے جس کا اندازہ صرف اربابِ ذوق کرسکتے ہیں۔ اِن کے کلام میں انتخاب دشوار ہے تاہم اس عنوان کی ماتحت مثلاً حسب ذیل اشعار ملاحظہ طلب ہیں ؎

اللہ رے دیوانگیٔ شوق کا عالم ۔۔۔ اک رقص میں ہر ذرۂ صحرا نظر آیا
تھا لطفِ جنوں دیدۂ خونابہ فشاں سے ۔۔۔ پھولوں سے بھرا دامنِ صحرا نظر آیا

موجِ نسیمِ صبح کے قربان جائیے ۔۔۔ آئی ہے بوئے زلف معنبر لئے ہوئے
وہ اک دل و دماغ کی شادابیٔ نشاط ۔۔۔ گر نہ چمک کے اُف تری برقِ نگاہ کا
سو بار جلا ہے تو یہ سو بار بنا ہے ۔۔۔ ہم سوختہ جانوں کا نشیمن بھی بلا ہے
پھر ان لبوں پہ موجِ تبسم ہوئی عیاں ۔۔۔ سامان رقص جوششِ تمنا لئے ہوئے

مجھ کو نہیں ہے تاب خلشہائے روزگار — دل ہے نزاکتِ غمِ لیلا لئے ہوئے

کوثر کی موج تھی تری ہر جنبشِ خرام — شاداب ہو گیا چمنستانِ آرزو

اس سے زیادہ اور کیا شوخیٔ نقشِ پا کہوں — برق سی اک چمک گئی آج سرِ نیاز میں

جو مجھ پہ گذری ہے شب بھر وہ دیکھ لے ہمدم — چمک رہا ہے مژہ پر ستارۂ سحری

دلِ مبتلا، مائلِ تمکیں اتقا — جامِ شراب نرگسِ رُسوا لئے ہوئے

اس آخری شعر کے دونوں مصرعوں کا توازن خاص طور پر ملاحظہ طلب ہے پہلے مصرعہ میں جس خیال کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس کا تقاضا تھا کہ الفاظ میں متانت اور سنجیدگی کے علاوہ ایک حد تک ثقل ہوتا کہ ایک زاہد خشک پر ابتدائی مراحل عشق میں کشاکش کی جو کیفیت ہوئی ہے اور جس طرح وہ اپنی ثقاہت سابقہ کو قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا اظہار خود ترکیب الفاظ سے ہو سکے لیکن دوسرے میں حسن کی زاہد فریب اور توبہ شکن ادائیں دکھانی مقصود ہیں، اسلئے اس کا ہر ہر لفظ اپنے ترنم کے اعتبار سے کیف و سرمستی کا اک جامِ سرشار ہے۔

بُت تراشی

باایجاد و تخلیق، صنعت بُت تراشی جن خوبیٔ ذہنیت کی رہینِ منت ہے وہی جب دنیائے شاعری میں برسرِ عمل ہوتے ہیں تو اُسے اصطلاح بلاغت میں باعتبار فرق بتدریج ندرت بیان ایجاد و طرز، اور خیال آفرینی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جس طرح ایک بُت تراش اولاً اپنے متخیلہ میں ایک صورت قائم کرتا ہوا اور پھر اُسی

پیکرِ خیالی کے مطابق ایک مجسّمہ گھڑتا ہو اور مجسّمہ میں جس پہلو کو نمایاں کرنا اس کا مقصود ہوتا ہے اسی کی مناسبت سے اس مجسّمہ کا ایک ایک حصّہ تراشتا ہے، اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ مختلف صنعت کائنات سے مختلف اجزا لے کر ایک نئی قسم کا مخلوق گڑھ لیا جاتا ہے یا محض ایک مفہوم ذہنی اور کیفیت رُوحانی کو مجسّم کر دیا جاتا ہے، کبھی کبھی ایک ہی موجود واقعی کے شئوں مختلفہ اور حیثّیات متضادہ کو مستقل طور پر علیحدہ علیحدہ نمایاں کرنے کے لئے الگ الگ مجسمے بنائے جاتے ہیں اور ہر بُت تراش اُس کی کوشش کرتا ہے کہ اُس کی مخلوقات مجازی بجائے خود مستقل ہوں اور باوجود وحدت فکر دوسرے نمونہ ہائے صنعت کی کورانہ تقلید نہ معلوم ہوں، شاعر کی حالت بھی بجنسہٖ یہی ہوتی ہے، علم و ادراک تفحص و استقرار فکر و نظر سے شاعر کے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوتا ہے، خواہ کسی سبب خارجی یا داعیہ باطنی کی تحریک سے اس پر کوئی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اور وہ اپنی استعداد فکری کے تقاضے سے اکثر اختیاری اور کبھی کبھی اضطراری طور پر اس خیال یا کیفیت کو نغمۂ موزوں میں ظاہر کرتا ہے۔

یہ خیال اور کیفیت بہت شاذ طریقہ پر ممکن ہے کہ بالکل جدید ہو ورنہ عموماً وہی خیالات و واردات ہوتے ہیں جو کسی نہ کسی صورت میں ادا کئے جا چکے ہیں لیکن ایک شاعر اسی سابقہ خیال میں (۱) یا تو کچھ اضافہ کر کے داد ایجاد دیتا ہے — (۲) یا ایک خیال کے پہلو کو بدل کر اسی کا دوسرا پہلو پیشِ نظر کر دیتا ہے۔ (۳) یا وہ مختلف خیالات کی ترکیب و امتزاج سے ایک نیا پیکرِ خیال پیدا کرتا ہے، یہ تمام صورتیں خیال آفرینی کہی جا سکتی ہیں لیکن اگر کسی پامال خیال کو اپنی جگہ پر قائم رکھ کر طرزِ ادا سے اس میں نئی رُوح پھونک دی ہے تو اُس کو بداعت اسلوب، ندرتِ بیان اور طرفگیٔ ادا

سے موسوم کیا جاتا ہے۔

بداعتِ اسلوب کبھی اظہارِ خیال کی ترتیب اور بیان کا پیرایہ بدل دینے سے پیدا ہوتی ہے کبھی ندرتِ تشبیہات اور طرفگی استعارات سے صبائے کہن کو نئے ساغر و مینا میں پیش کیا جاتا ہے۔ اور کبھی کسی پُرانی تصویر پر جدّت کے موقلم سے ہلکا سا رنگ دیکر یا پُرانے رنگ کو نئی جھلک (شیڈ) دیکر تازگی پیدا کی جاتی ہے، بقول اصغرؔ ؎

تو بشمعِ حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے
فانوس کی گردش سے کیا کیا نظر آتا ہے

دراصل یہی ندرتِ بیان شاعری کی رُوح ہے ہر شعر میں بالکل نئی اور اچھوتی تخیل پیش کرنا ناممکن ہے لیکن فرسودہ اور پامال خیالات کو دوبارہ بغیر کسی ندرتِ بیان کے پیش کرنا شاعر کو نقد و نظر کے محکمۂ احتساب میں ایک قابلِ تعزیر مجرم قرار دیتا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہر جدید تخیل یا ہر نئی طرزِ ادا بلا کسی تخصیص کے دلفریب ہوتی ہے، تنوع بے شک پسندیدہ ہے مگر موسیقی کی طرح اس میں بھی احساس توازن اور سوسائٹی کے معیارِ تمدّن کا لحاظ لازمی ہوگا تاکہ شاعری کی کائناتِ خیالی مذاقِ سلیم پر گراں نہ ہو۔ شعرائے ایران میں بابائے فغانیؔ، نظیریؔ اور عرفیؔ استادانِ ریختہ میں غالبؔ، مومنؔ، اور دورِ حاضر میں اصغرؔ و فانیؔ کا کلام ندرتِ بیان کے لئے بطور نمونہ پیش کیا جاسکتا ہے۔ طبیعت چاہتی تھی جن جزئیات کا احصار سطورِ بالا میں کیا گیا ہے ان کو مثالاً اشعار اساتذہ سے واضح کیا جاتا مگر بخوفِ طوالت نظرانداز کرتا ہوں۔ یہاں جنابِ اصغرؔ کے کلام سے ندرتِ بیان یا بداعتِ اسلوب کی چند مثالیں

ہدیۂ اربابِ ذوق ہیں۔

اصغر صاحب کی شاعری چونکہ جامع حثیات ہے لہٰذا عنوان موسیقی کی طرح اِس موقع پر بھی جو اشعار نقل کئے جاتے ہیں اس حسن مخصوص کے علاوہ اور محاسن بھی ہیں مگر ندرتِ بیان کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ اِس لئے یہی سُرخی اُن کے لئے زیادہ مناسب ہے۔ فرماتے ہیں ؎

(۱) مری وحشت پہ بحث آرائیاں اچھی نہیں ناصح
بہت سے باندھ رکھے ہیں گریباں میں نے دامن میں

(۲) کیا کیا ہوا ہنگامِ جنوں یہ نہیں معلوم — کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا
سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا — جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

وارفتگی شوق کے عالم میں متخیلہ جس صورت کو ہمارے سامنے محبوب بنا کر پیش کرتا ہے وہ حقیقت میں خود ہمارے ہی جذبات کی کرشمہ سازی ہوتی ہے ہم اس حقیقت کا احساس اس وقت کرتے ہیں جب وہ ولولہ باقی نہیں رہتا اور نگاہِ بصیرت کے سامنے سے استیلائے شوق کا حجاب اُٹھ جاتا ہے۔ اس فلسفیانہ نکتہ کے علاوہ تصوف کا پہلو بھی اس شعر میں ہے۔ اس دقیق فلسفہ کو جس مؤثر پیرایہ میں ادا کیا گیا ہے وہ صرف اصغر صاحب کا حصہ ہے ؎

(۴) کچھ نہ ہم سے ہو سکا اس اضطرابِ شوق میں — اُن کے دامن کو مگر اپنا گریباں کر دیا
(۵) اِس طرح زمانہ کبھی ہوتا نہ پُر آشوب — فتنوں نے ترا گوشہ داماں نہیں دیکھا
(۶) غضب ہوا کہ گریباں ہے چاک ہونے کو — تمھارے حسُن کی ہوتی ہے آج پردہ دری

عشق کی خستہ حالی حسُن کی رُسوائی ہے۔ اِس خیال کے علاوہ وحدت

حسن و عشق کا نکتہ کس لطیف انداز میں نظم ہو گیا یعنی ہمارا گریبان چاک ہوا اور یہ پردہ ہٹا تو تم خود نمایاں ہو جاؤ گے ۔

(۷) پھر گئی آنکھوں کے نیچے وہ ادائے برق حسن

چیخ اُٹھے سب مرا چاکِ گریباں دیکھ کر

عشق کی بے سروسامانی حسن کا آئینۂ جمال ہے نکتہ وس نگاہیں مسبب میں سبب کا جلوہ دیکھ کر متاثر ہو سکتی ہیں اِس خیال کو کس اچھوتے پیرایہ میں دکھایا گیا ہے ۔

(۸) اک شعلہ اور شمع سے بڑھ کر ہے رقص میں

تم چیر کر تو سینۂ پروانہ دیکھتے

(۹) اے حسنِ ازل اپنی اداؤں کے مزے لے

ہے سامنے آئینۂ حیرانِ محمدؐ

توحید و رسالت کے ربطِ خفی کا نکتۂ بلند پایہ آدابِ شریعت کے ساتھ جس ذوق کی زبان سے اُدا کیا گیا ہے اِس کو صرف اہلِ بصیرت سمجھ سکتے ہیں ۔

(۱۰) اسرارِ حقیقت کو ایک ایک سے پوچھا ہے

ہر نغمۂ رنگیں سے ہر شاہدِ رعنا سے

اس میں شک نہیں کہ صاحبِ ذوق آواز دولاب سے مست ہو سکتا ہے لیکن اگر ذوق کے ساتھ امتیاز بھی باقی ہے تو ہم کسی فرد تر یا سخیف مظہر میں اس اعلیٰ حقیقت کو خود دیکھنا پسند نہیں کر سکتے بلکہ صرف نغمۂ رنگیں اور شاہدِ رعنا کے پردہ میں شاہدِ حقیقت کی تلاش کرتے ہیں ۔

(۱۱) یا زندگی تو تھی ہر موجِ حوادث کی   یا موت کا طالب ہے انفاسِ مسیحا سے

(۱۲) آہوں نے مری خرمنِ ہستی جلا دیا — کیا منہ دکھاؤں گا تری برقِ نظر کو میں

یہاں پر حسُن و عشق کی نسبت ایک دوسرا نظریہ بیان کیا گیا ہے جو اشعار سابقہ سے بالکل مختلف ہے ؎

(۱۳) رحمتِ حق نے بہت دیکھ لی ایماں کی بہار — اَب ذرا سامنے رعنائیٔ عصیاں کر دیں

(۱۴) دیر کی راہ نہ ملتی ہو تو کعبہ ہی سہی — کفر جب کفر نہ بنتا ہو تو ایمان کر دیں

(۱۵) آج خوں گشتہ تمنائیں مجھے یاد آ گئیں — ہر طرف ہنگامۂ جوشِ بہاراں دیکھ کر

(۱۶) مری نگاہ نے جُھک جھک کے کر دیے سجدے — جہاں جہاں کہ تقاضائے حُسنِ یار ہوا

(۱۷) یہ بھی فریب ہیں کچھ دردِ عاشقی کے — ہم مر کے کیا کریں گے کیا کر لیا ہے جی کے

(۱۸) جوشِ شباب نشۂ صہبا ہجومِ شوق — تعبیر یوں بھی کرتے ہیں فصلِ بہار کو

(۱۹) آ جا نکل کے سامنے اے شوقِ مستِ حُسن — میں جانتا ہوں پردۂ ابرِ بہار کو

(۲۰) پردۂ لالہ و گل بھی ہے بَلا کا خونریز — اَب زیادہ نہ کرے حُسن کو عریاں کوئی

(۲۱) مٹی جاتی ہے بلبل جلوہ گلہائے رنگیں پر — چھپا کر کس لئے پردوں میں برقِ آشیاں رکھدی

(۲۲) جبینِ شوق لائی ہے وہاں سے داغِ ناکامی — یہ کیا کرتی رہی کمبخت ننگِ آستاں برسوں

(۲۳) زرگی کچھ لذّتِ افتادگی میں اعتنا میں نے — مجھے دیکھا کیا اُٹھ کر غبارِ کارواں برسوں

(۲۴) محبّت ابتدا سے تھی مجھے گلہائے رنگیں سے — رہا ہوں آشیاں میں لیکے برقِ آشیاں برسوں

(۲۵) کچھ اس انداز سے چھیڑا تھا میں نے نغمۂ رنگیں — کہ فرطِ ذوق سے جھومی ہے شاخِ آشیاں برسوں

صنائع بھی اسی ندرتِ بیان کے تحت میں آتی ہیں لیکن صنائع کا لطف یہ ہے کہ بیساختہ پن سے اَدا کی جائیں اور معنویت کا خون نہ ہو، نہ سامع پر یہ اثر پیدا ہو سکے کہ قصداً صنائع کے لحاظ سے شعر لکھا گیا ہے بلکہ یہ معلوم ہو کہ خود بخود زبانِ قلم سے

تراش ہوگئی ہے۔ اصغر کے یہاں اِس کی مثالیں بہت ہیں یہاں پر صرف حسب ذیل اشعار پر اکتفا کیا جاتا ہے ؎

روتے ہیں منہ پہ دامنِ صحرا لئے ہوئے
جوشِ جنوں میں چھوٹ گیا آستانِ یار

ہوش بھی تو نہیں ہے اب پاؤں کہاں ہے سر کہاں
کیجیے آج کس طرح دوڑ کے سجدۂ نیاز

اور میں خود ہوں ایک پردۂ راز
راز کی جستجو میں مرتا ہوں

کبھی کبھی ندرتِ بیان پیدا کرنے کے لئے غیر ذی رُوح اشعار یا کیفیات مجردہ کو ذی روح فرض کرلیا جاتا ہے مثلاً ؎

حسن جاگ اٹھا ہیں جب عشق نے فریاد کی
تمتما اُٹھے وہ عارض میری عرضِ شوق پر

غنچوں کی کھُلیں آنکھیں دامن کی ہوا آئی
بیدار ہوا منظر اِس مستِ خرامی سے

کبھی کبھی ندرت استعارہ اور حسُن ترکیب سے بھی یہ بات پیدا کی جاتی ہے مثلاً ؎

اب ٹپکتا نہیں آنکھوں سے گلستاں کوئی
دل میں اک بوند لہو کی نہیں رونا کیسا

جانِ بہار نرگسِ رُسوا کہیں جسے
زندانیوں کو آکے نہ چھیڑا کرے بہت

ایسا حجاب چشمِ تماشا کہیں جسے
اِس جلوہ گاہ حسُن میں چھایا ہے ہر طرف

اک حسُن کی دُنیا ہے خاکستر پروانہ
انداز ہیں جذب اسمیں سب شمع شبستاں کے

یہ جانِ حزیں ہے کہ سبستان حرا ہے
ہے تیرے تصور سے یہاں نور کی بارش

دوزخ بگریباں ہے فردوس بداماں ہے
ہے عشق کہ محشر میں یوں مست و خراماں ہے

ندرتِ خیال اس کا اظہار چونکہ کبھی مصوری کے رنگ میں ہوتا ہے اور کبھی حکیمانہ نکتہ سنجی کے انداز میں ہوتا ہے اِس لئے اس طرح کے اشعار دو عنوانوں کے تحت میں پیش کئے جائیں گے۔

ہاں اسقدر گذارش اور ہے کہ خود مصوری اور بت تراشی باہم اس قدر مشابہ اور ہم جنس ہیں جن کے حدود متعین کرنا سخت دشوار ہے اور شاعری میں اگر تو یہ فرق اور بھی نازک ہوجاتا ہے۔ اسی طرح حکیمانہ نکتہ سنجیاں بھی چونکہ اکثر کیفیات رومانی کی مادی مظاہر سے متعلق ہوتی ہیں اور اکثر الہیات یا ما بعد الطبیعات کے اسرار و رموز کو سہولت فہم کے لئے تشبیہات مادی سے ادا کیا جاتا ہے اسلئے محاسن شعریہ کے یہ مختلف پہلو ایک دوسرے سے جدا نہیں کئے جاسکتے نہ ان کی بتویب و تفصیل کے کسی خاص منطقی اصول پر کی جاسکتی ہے مثال کے طور پر زور بیان، رنگینی ادا جوش و سرمستی یا سوز و گداز کو لیجئے ان میں سے ہر انداز مصوری و بت تراشی دونوں کے تحت میں آسکتا ہے اور ہر ایک پر ندرتِ بیان کا بھی اطلاق ممکن ہے مگر میں ان حثیات چہارگانہ کو مصوری کی مختلف شعبے سمجھتا ہوں۔ ناظرین کو اختلاف رائے کا حق حاصل ہے۔

مصوّری

شاعری کا ایک ضروری عنصر اور بعض ارباب فن کے خیال میں اس کی اصلی جان مصوری ہے یہی میدانِ تخیل کا اصلی جولانگاہ ہے اور یہیں پر ایک شاعر کو اپنے کمالِ فن کی سحر کاریاں دکھانے کا موقع ملتا ہے۔ مصوری کے دو مدارج ہیں کمال مصوری اور حسن مصوری۔

کمال مصوّری مصوّر کو تخیل کے علاوہ اپنے کمال فن کے لئے لطافتِ احساس، قوت مشاہدہ اور صدقِ اظہار کی ضرورت ہے اور یہی صفات شاعر کے لئے بھی ناگزیر ہیں۔

لطافتِ احساس ایک مصوّر یا شاعر اگر احساس لطیف لے کر نہیں آیا اور خود

اس میں تاثر یا انفعال کی قابلیت نہیں ہے تو وہ دوسروں کو متاثر نہیں کرسکتا اسی نکتہ کو ملحوظ رکھ کر یہ کہا گیا ہے کہ " آنچہ از دل خیزد بردل ریزد " اور شاعر و مصور کی سطح چونکہ عام خلائق سے بالاتر ہے لہٰذا ان کے تاثر انفعال میں لطافت ضروری ہے ورنہ شعر یا تصویر میں خواہ مخواہ بھونڈا پن آجائے گا۔

قوتِ مشاہدہ شاعر یا مصور کی نگاہ کو عوام کی نظر سے کہیں زیادہ تیز اور نکتہ رس ہونا چاہیئے تاکہ اِن نازک اور لطیف جذبات و کیفیات تک اس کی دسترس ہوسکے جہاں ہر نگاہ ظاہر نہیں پہونچ سکتی۔

صدق اظہار شاعر یا مصور کا کمال یہ ہے کہ جن کیفیات سے جس طرح وہ خود متاثر ہوا ہے اسی طرح مخاطب تک منتقل کرنے کی کوشش کرے، تاکہ اس پر بھی وہی کیفیت طاری ہوسکے۔ یقین طبائع شوق تنوع اور تلاش ندرت میں دنیائے حقیقت سے بالکل دُور جا پڑتی ہیں، اس لیئے ہزار فکر کے بعد بھی ان کے نتیجۂ فکر میں نہ شانِ واقعیت ہوتی ہے نہ اصلیت کا رنگ۔ یہی وجہ ہے کہ مخاطب میں کسی جذبہ کی تحریک نہیں ہوتی۔ تصویر میں واقعیت یعنی اصل سے مطابقت ضروری ہے لیکن دنیائے مصوری کی واقعیت یہ نہیں ہے کہ خواہ مخواہ تصویر میں اصل کی کل جزئیات ظاہر کی جائیں۔ اِس کے لئے صرف اس قدر واقعیت کافی ہے کہ جو کچھ اُس نے محسوس کیا ہے اور جس خاص بات سے وہ متاثر ہوا ہے اُس کو تصویر میں نمایاں کردے اسی طرح شاعر کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنے موضوع شعر کی تمام تفصیلات کا استعصا کرے یا ایک مصور کی طرح اس کی مکمل تشریح پیش کرنے کی کوشش کرے شاعر کا روئے سخن جذبات کی طرح ہوتا ہے لہٰذا اس کو صرف ایک تاثر انگیز پہلو دکھا کر گذر جانا چاہیئے۔ بسا اوقات شاعر کا موضوع سخن ایک ایسی بے کیف و کم اور ناقابل اظہار

حقیقت ہوتی ہے جو الفاظ کا تحمل نہیں کر سکتی شاعری کی مصوری صرف اسقدر ہے کہ اپنے موضوع شعر کی طرح دُور سے ایک اشارہ کر کے مخاطب کے احساسات و ادراکات اُسی طرف مائل کر دے اور جو کچھ شاعر نے دیکھا تھا۔ اگر ٹھیک وہی نہیں تو قریب قریب وہی چیز شاعر کے مخاطب کو بھی نظر آنے لگے گی۔ اصغر نے کیا خوب کہا ہے ؎

اگر خموش رہوں میں تو تو ہی سب کچھ ہے
جو کچھ کہا تو ترا حُسن ہو گیا محدود

حسنِ مصوری کمال مصوری اور حُسنِ مصوری میں فرق یہ ہے کہ ہر کمال حسن نہیں ہے مگر ہر حُسن کمال ہے۔ کمال مصوری یہ ہے کہ تصویر اصل کے مطابق ہو یا یوں کہیے کہ تصویر خود بول اُٹھے اس سے بحث نہیں کہ وہ تصویر کس چیز کی ہے مگر وہ اشیا اور نفرت انگیز مناظر کی تصویر بھی اگر ہو بہو کھینچ جائے تو ایک نمونہ کمال ضرور ہے مگر حسُن مصوری کے منافی ہے اسی طرح بعض اوقات مصوّر قصداً واقعیت کا کوئی حصّہ حسنِ تصویر کو قائم رکھنے کے لئے حذف کر دیتا ہے۔ مثال کی ضرورت نہیں۔ اُردو شاعری میں مصوّری بہت شاذ ہے اور اگر ہے بھی تو علاوہ چند مستثنیات کے حسُنِ مصوّری سے عاری ہے بعض اشعار میں جس طرح کی مصوّری کی گئی ہے اس سے کسی جذبہ کو تحریک نہیں ہو سکتی بلکہ جن جذبات کی تحریک ان کا مقصود ہو سکتا ہے وہ اگر موجود رہے بھی ہوں تو اس تصویر کے نفرت انگیز اثر سے فنا ہو جائے مثلاً آنکھیں دکھلاتے ہو ....
اس قسم کی مثالیں حسُنِ مصوّری کی صنف میں نہیں آتیں حسُن مصوری کی مثال میں نظام کی یہ غزل پیش کی جا سکتی ہے ؎

انگڑائی بھی لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ   دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ

دینا وہ اُن کا ساغرِ مئے یاد ہے نظامؔ   مُنہ پھیر کر اُدھر کو اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

اِن اشعار میں محض کیفیت مادّی کی مصوری ہے لیکن اگر کیفیات ذہنیہ کی مصوری ہو تو اس سے بہتر چیز ہے مثلاً ؎

لئے جاتا تھا جنوں جانبِ صحرا ہم کو
دیکھتے جاتے تھے مُنہ پھیر کے گھر کی صورت

حُسن مصوری کے لئے سلیقہ انتخاب حُسنِ ترکیب اور سلامت مذاق لازمی ہے ـــــ

سلیقہ انتخاب سے مراد موضوع تصویر کا انتخاب ہے یعنی اُنھیں اشیاء کی مصوری کی جائے جن میں بجائے خود کوئی ادائے دلکش موجود ہے اور طبائع انسانی سے اُن کو فی نفسہ مناسبت ہے اور پھر اس موضوع تصویر کا وہی پہلو نمایاں کیا جائے جو قابلِ اظہار ہو اُردو شاعری میں حسنِ انتخاب کی مثالیں شاذ ہیں اور اکثر تو ایسی مصوری کی گئی ہے جس سے طبیعت متنفر ہوتی ہے۔ مثلاً ؎

جو برسات میں تا درِ یار پہونچے
بہانا کیا خود گرے ہم پھسل کر

سبحان اللہ تصویر تو یہ ضرور ہے مگر کس کی ایک بوالہوس بدنصیب اور بدمذاق انسان کی۔ بوالہوس اس لئے کہ خود بخود نہیں گرا بلکہ بہانہ کرتا ہے۔ بدنصیب اسلئے کہ دریار تک پہونچ کر بھی آستانہ بوسی نصیب نہیں ہوئی بلکہ کم بخت گرتا بھی ہے تو کہاں کیچڑ یا کیچ میں الفاظ کی صحت کا فیصلہ حضرات دہلی و لکھنؤ فرمالیں۔ مثلاً ؎

میں نے ان کے سامنے اوّل تو خنجر رکھ دیا
پھر کلیجہ رکھدیا دل رکھدیا سر رکھدیا

اس میں تفصیل سے تصویر تو پیدا ہوگئی مگر کس چیز کی ؟ ایک قصاب کی دوکان پیش نظر ہوگئی۔ ملاحظہ ہو ——— پھر کلیجہ رکھدیا دل رکھدیا سر رکھدیا

حسن ترکیب ۔ تصویر میں جو رنگ بھرا جائے وہ نہ بہت گہرا اور شوخ ہو نہ بالکل پھیکا۔ اور پژمردہ بلکہ ایک خفیف تموج اور تدریجی تغیر کے ساتھ شوخی و لطافت دونوں کی اس طرح آمیزش ہو کہ دونوں کے محاسن قائم اور نمایاں رہیں لیکن ایک کو دوسرے سے جدا کرنا دشوار ہو جس طرح سپیدۂ سحری میں دن کی روشنی اور رات کا سکون مل کر ایک عجیب و غریب سامان پیدا کر دیتے ہیں اور یہ امتیاز دشوار ہوتا ہے کہ اس طباشیر صبح کی دلفریبی میں شعاعِ آفتاب کا حصّہ زیادہ ہے یا پردۂ شب کی اس ہلکی سی تہہ کا جواب بھی رُوئے آفتاب پر نقاب بن کر پڑی ہوئی ہے۔ اور چند لمحوں میں تجلّی ہوا چاہتی ہے، مثال کے طور پر یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

رُخِ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسّم ہائے پنہاں کی
شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی

ریعانِ شباب اور احساسِ حسن کے مجموعی اثر سے عارضِ گلرنگ پر جو ہلکا سا نورانی تموّج ہے اُس نے پیکرِ جمال میں بلا کی دلفریبی پیدا کر دی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا سورج کی شعاعیں پھولوں سے کھیل رہی ہیں۔ رنگ و نور کی اس آمیزشِ لطیف نے دونوں کی شان دوبالا کر دی ہے ایک نکتہ اس شعر میں اور بھی قابلِ ملاحظہ ہے کہ کھلکھلا کر ہنسنا تو درکنار شاعر کا ذوقِ لطیف تبسم آشکار کو بھی محبوب کی شانِ خودداری کے منافی سمجھتا ہے اور محض تبسم پنہاں پر اکتفا کرتا ہے۔

سلامت مذاق ۔ ماحول سے مطابقت سوسائٹی کے معیارِ تمدّن اور

موضوع تصویر کی حیثیت وشان کا لحاظ بھی حسن کا جزو لاینفک ہے اور اسی کو یہاں سلامت مذاق سے تعبیر کیا گیا ہے مثلاً لیلیٰ اور کوئن میری کی تصویریں اگرچہ بجائے خود بالکل مطابق اصل ہوں مگر لیلیٰ کو صحرائے نجد میں سایہ پہنا کر موٹر میں دوڑا دینا اور کوئن میری کو اسکاٹ لینڈ کی پہاڑیوں پر محل میں بٹھا کر جان بُل کے ہاتھ ناقہ کی مہار دیدینا کس قدر مضحکہ انگیز ہو سکتا ہے عدم مطابقتِ ماحول سے جو بدمزاقی شعر کی مصوری میں پیدا ہو جاتی ہے اس کی مثالیں اُردو شاعری میں بکثرت مل سکتی ہیں یہ دو شعر نمونے کے لئے کافی ہیں ؎

نکالی مانگ انھوں نے تو میرے دل نے کہا
نکل رہی ہے سڑک یہ بلا کے آنے کی

یہاں پر سڑک کا تخیل فقدانِ ذوق نہیں تو کیا ہے ؎

اُلجھا ہے پاؤں یار کا زُلفِ دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا

جس وقت یہ حادثہ وقوع میں آیا تھا اُس وقت خوش قسمتی سے کوئی فوٹو گرافر موجود نہ تھا جو جالِ جاناں کی یہ دلفریب ہیئت کھینچ کر دردمندانِ محبت کو ہمیشہ کے لئے اس جانکاہ مرض سے نجات دلا جاتا۔

یہی درازئ زلف غالب کے یہاں بھی ہے مگر دیکھئے کس شان سے ادا کی گئی ہے۔

بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

غالب احترام حسن کا اندازہ داں ہے وہ یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ محبوب کے گیسو جاروب کشی

کریں یا پاؤں میں الجھ کر رہ جائیں۔ یہاں ایک نکتہ اور بھی قابل لحاظ ہے کہ ایک نقاش اور ایک شاعر کی مصوری میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

نقاش حسن باصرہ کے ذریعہ سے اپنے مخاطب سے اپیل کرتا ہے مگر شاعر کی معنویت اور موسیقی باہم مل کر ایک طرف تو سامعہ کے ذریعہ سے شاعر کے احساسات کو مخاطب کیطرف منتقل کرتی ہے اور دوسری جانب متخیلہ ایک کیفیت کو مجسّم کر کے نگاہ کے سامنے کر دیتا ہے اور اگر مصوری کے ساتھ اسرار و معارف کا بھی کوئی نکتہ شعر میں ادا ہوا ہے تو نفس ناطقہ بھی متاثر ہوتا ہے اور اگر نکتے میں ذوق عرفاں کی بھی کوئی چاشنی ہے تو انسانیت کے اس ملکوتی عنصر پر بھی عالم وجد و حال طاری ہو جاتا ہے جس کو عام طور پر روحانیت کہتے ہیں یہاں پر بطور مثال جناب اصغر کے کلام سے مصوری کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱) قفس تک کسطرح صیاد لایا دیکھ لو جا کر — پڑے ہوں گر ابھی کچھ بال و پر میرے نشیمن میں

حفظ آزادی کے لئے جو سعیٔ ناکام کی گئی ہے اُس کی کتنی صحیح تصویر ہے۔

(۲) رخ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی — شعاعیں کیا پڑیں رنگتِ نکھر آئی گلستاں کی

(۳) ڈوبا ہوا سکوت میں ہے جوشِ آرزو — اب تو یہی زبان مرے مدعا کی ہے

(۴) دشتِ غربت کیطرف اک آہ بھر کر حسرت کی — گرد کو پہروں میرے اہلِ وطن دیکھا کئے

(۵) مستی سے تیرا جلوہ خود ارضِ تماشا ہے — آشفتہ مزاجوں کا یہ کیفِ نظر دیکھو

عشق کی نگاہ و شوق سے حسن پر ایک نشہ سا چھا جاتا ہے یہ کیف جمالِ محبوب کو خود جذب نظر کے لئے بیتاب کرتا ہے۔ نفسیات حسن و عشق کے اس دقیق نکتہ کی کتنی سہی مصوری کی گئی ہے ؎

(۶) یہ دیکھتا ہوں ترے زیرِ لب تبسم کو — کہ بحرِ حسن کی اک موج بے قرار نہ ہو

(۷) قفس کی یاد میں یہ اضطرابِ دل معاذ اللہ — کہ میں نے توڑ کر اک ایک شاخِ آشیاں رکھ دی

(۸) اُفتادگانِ عشق نے سر ابتو رکھ دیا — اٹھیں گے بھی تو نقشِ کفِ پا لئے ہوئے

(۹) کچھ اس ادا سے میرا اس نے مدعا پوچھا — ڈھلک پڑا مری آنکھوں سے گوہرِ مقصود

(۱۰) اسکی نگاہِ ناز نے چھیڑا کچھ اس طرح — ابتو اچھل رہی ہے رگِ جانِ آرزو

(۱۱) رودادِ چمن سنتا ہوں اسطرح قفس میں — جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

(۱۲) نہ کی کچھ لذتِ افتادگی میں اعتنا میں نے — مجھے دیکھا کیا اٹھ کر غبارِ کارواں برسوں

(۱۳) اصغرؔ مجھے جنوں نہیں لیکن یہ حال ہے — گھبرا رہا ہوں دیکھ کے دیوار و در کو میں

(۱۴) سب مزے کر دیئے خورشید قیامت نے خراب — میری آنکھوں میں تھا اک روئے دل آرام ابھی

(۱۵) پھر گرمِ نوازش ہے ضوعِ مہرِ درخشاں کی — پھر قطرۂ شبنم میں ہنگامۂ طوفاں ہے

(۱۶) یہ حسن کی موجیں ہیں یا جوشِ تبسم ہے — اُس شوخ کے ہونٹوں پر اک برق سی لرزاں ہے

(۱۷) رہ رہ کے چمکتی ہے وہ برقِ تبسم بھی — لہریں سی جو اُٹھتی ہیں کچھ چشمِ تمنا میں

(۱۸) اُس عارضِ رنگیں پہ عالم وہ نگاہوں کا — معلوم یہ ہوتا ہے پھولوں میں صبا آئی

(۱۹) بکھری ہوئی ہو زلف بھی اُس چشمِ مست پر — ہلکا سا ابر بھی سرِ میخانہ دیکھئے

(۲۰) کیا میرے حال پہ سچ مچ اُنھیں غم تھا قاصد — تو نے دیکھا تھا ستارا سرِ مژگاں کوئی

(۲۱) میری فغانِ درد پہ اُس سروِ ناز کو — ایسا سکوت ہے کہ تقاضا کہیں جسے

(۲۲) مجھی سے بگڑے رہتے ہیں مجھی پر ہے عتاب اُنکا — ادائیں چھپ نہیں سکتیں نوازش ہائے پنہاں کی

(۲۳) تم دید کو کہتے ہو آئینہ ذرا دیکھو — خود حسن نکھر آیا اُس کیفِ تماشا سے

(۲۴) عارضِ رنگیں پہ انکے رنگ سا کچھ آگیا — اُن گلوں کو چھوڑ کر ہم نے گلستاں کر دیا

(۲۵) لذتِ سجدہ ہائے شوق نہ پوچھ — ہائے وہ اتصالِ ناز و نیاز

(۲۶) اُس جوئے یارِ حسن سے سیراب ہے فضا ۔۔۔۔ رد کو نہ اپنی لغزشِ مستانہ وار کو
(۲۷) ہم خستگانِ راہ کو راحت کہاں نصیب ۔۔۔۔ آواز کان میں ابھی بانگِ درا کی ہے

اسرار و معارف وہاں تک وسعتِ آبادِ سخن کی وہ منزلیں تھیں جہانتک دوسرے فنونِ لطیفہ کی رسائی ممکن نہیں ہے لیکن ابھی سدرۃ المنتہیٰ کے آگے اسرارِ حکیما اور معارفِ الٰہیہ کی بزمِ تجلّی شروع ہو جاتی ہے جہاں صرف شاعر کی تخیل کو باریابی کا اذن مل سکتا ہے۔ اور یہی مقام شاعری کی معراج ہے۔ اگر ایک شاعر رنگ و بو سے گذر کر فلسفہ حکمت کے نکتہ ہائے سربستہ مذہب کے اسرار و رموز اور مراحل سلوک و عرفاں کی کیفیات مروّجہ اسی ترنّم اسی جدّت بیان اور اسی حسنِ مصوّری کے ساتھ ادا کرتا ہے تو اُس کی شاعری سحر سے گذر کر اعجاز بن جاتی ہے اس طرح کے شاعر کے لئے بصیرت تاثر اور قوتِ بیان تینوں کا اجتماع ضروری ہے یعنی ایک طرف تو قوتِ مشاہدہ اتنی تیز ہونی چاہیئے کہ نہایت دقیق نکتوں تک پہونچ سکے، دوسری جانب احساس اتنا لطیف ہونا چاہیئے کہ وہ غیر مادی حقائق سے بھی لذّت اندوز ہو سکتا ہو اور ان دونوں مراحل کے بعد قوتِ بیان ایسی ہونا چاہیئے کہ عرفان و ذوق کی اس مجموعی کیفیت کی تصویر اک نئے انداز کے ساتھ شعر نغمۂ موضوع میں کھینچ کر دوسروں کو بھی لذّت اندوز کر سکے تو وہ ایک باکمال شاعر ہے اس موقع پر یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ نظم و شعر کا جو فرق ہے وہ یہاں بھی قائم رہتا ہے نازک سے نازک نکتۂ حکمت اور لطیف سے لطیف سرِ معرفت کو محض خوش طریقے پر نظم کر دینا شاعری نہیں ہے فلسفۂ و حکمت یا نفسیات و تصوف کی مصطلحات کا بے ضرورت بار بار اعادہ بھی شعر میں یہ کیفیتیں پیدا نہیں کر سکتا بلکہ کمالِ شاعری یہ ہے کہ حقائق و معارف کو گل و بلبل کی زبان

اور بادہ و ساغر کے رنگ میں پیش کیا جائے گا بقول حضرت اصغر ؎

پھر آج جوشِ سرِ حقیقت ہے موجزن   کچھ پردہ ہائے ساغر و مینا لیئے ہوئے

یہاں پر مختصر اسرار و معارف کے چند نمونے کلامِ اصغر سے پیش کئے جاتے ہیں اور بعض جگہ ان کے مطالب کی طرف اک خفیف سا اشارہ بھی کر دیا جائے گا ؎

ابتک تمام فکر و نظر پر محیط ہے   شکلِ صفات معنئ اشیاء کہیں جسے

یہی خیال اس شعر میں ادا کیا گیا ہے ؎

جس پہ میری جستجو نے ڈال رکھے تھے حجاب   بیخودی نے اب اُسے محسوس و عریاں کر دیا

پھر بھی نظر آیا نہ تماشا نظر آیا   جب تو نظر آیا مجھے تنہا نظر آیا

نظارہ بھی اب گم ہے بیخود ہے تماشائی   اب کون کہے اُس کو جلوہ نظر آیا ہے

تری نگاہ کے صدقے یہ حال کیا ہے میرا   کمالِ ہوش کہوں یا کمال بے خبری

ایک طالب جلوۂ ذات کے لئے یہ صفات بھی پردہ ہیں اسی لئے اہلِ بصیرت علم و عرفان اس کو کہتے ہیں کہ انسان کے تمام ادراکات پر جمالِ دوست کا استیلا ہو نا کہ ردِ منظور ذات و صفات کا فرق مٹ جائے۔ اسی مقام کو اصطلاح سلوک میں فنا کہتے ہیں ؎

تھیں خود نمودِ حسن میں شانیں حجاب کی

مجھکو خبر رہی نہ رخِ بے نقاب کی

جس طرح کمالِ بیخبری ہی اصل علم و عرفاں ہے اُسی طرح کمالِ ظہور بھی عین حجاب ہے اس حقیقت کی کتنی دلکش مصوری اس شعر میں کی گئی ہے۔

اس فلسفہ کے متعلق جناب اصغر کی ایک نظم (سرِ فنا) ہے جو غالباً اپنی جامعیت کمال کے لحاظ سے زبانِ اُردو میں بے مثل ہے ارباب ذوق دیوان میں ملاحظہ فرمالیں۔

یہ حقیقت اِن اشعار میں نمایاں کی گئی ہے ؎

پردۂ حرماں میں آخر کون ہے اسکے سوا — اے خوشا روزے کہ نزدیکی بھی ہے دوری بھی ہے
حسرتِ ناکام مری کام سے غافل نہیں — اک طریقِ جستجو بر دردِ مہجوری بھی ہے
میں تو ان محجوبیوں پر بھی سراپا دید ہوں — اسکے جلوے کی ادا اک شانِ مستوری بھی ہے
میری محرومی کے اندر سے یہ دی اُسنے صدا — قرب کی راہوں میں میرے راہ اک دوری بھی ہے

فلسفہ حسن و عشق حسن و عشق کے ربط باہمی کی نسبت مختلف نظریے ہیں، بعض کے نزدیک حسن فی نفسہٖ کوئی چیز نہیں خود ہمارا ذوقِ نظر اور ہماری بیتابیٔ شوق ایک چیز کو ہماری نگاہ میں محبوب بنا دیتی ہے یعنی بالفاظ دیگر عشق خالق حسن ہے، دوسرا نظریہ یہ ہے کہ اصل حقیقت محض حسن ہے اور حسن کا تقاضا ہے ظہور و خود نمائی اور یہ تقاضائے عشق کا محرک اور خالق ہے مذہب کی اصطلاح میں اسی کو توفیق کہتے ہیں تیسرا نظریہ ہے کہ حسن و عشق دونوں اپنی اپنی جگہ پر مستقل ہستیاں ہیں مگر ہر شخص کا معیار حسن فطری طور پر مختلف ہوتا ہے اور فطرت اپنے معیار پسند کی جستجو میں رہتی ہے اور جب اتفاق سے وہی چیز سامنے آجاتی ہے تو دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اُٹھتی ہیں اور اسی مطابق حسن و عشق سے دونوں کا فطری حسن نکھر آتا ہے۔ چوتھا نظریہ یہ ہے کہ تمام کائناتِ عالم چونکہ محض حسنِ ازل کا پرتو ہے لہٰذا حسن و عشق کی حقیقت ایک ہے شانیں مختلف ہیں، حضرتِ اصغر کے کلام سے ہر نظریہ کے متعلق مثالاً یہاں چند اشعار پیش کر دیے جاتے ہیں جس سے اُن کے کمالِ فن کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

پہلا نظریہ

تھیں نگاہِ شوق کی رنگینیاں چھائی ہوئی — پردۂ محمل اُٹھا تو صاحبِ محمل نہ تھا

اس میں وہی ہیں یا میرا حسنِ خیال ہے — دیکھوں اُٹھا کے پردۂ ایوانِ آرزو

میرے فراقِ شوق کا اس میں بھرا ہے رنگ — میں خود کو دیکھتا ہوں کہ تصویرِ یار کو

جبینِ شوق کی شوریدگی کو کیا کہئے — وگرنہ عشوہ طرازیٔ نقشِ پا معلوم

ستم ہوا ہے کرے مجھ پہ ذوقِ عکس نظر — بساطِ آئینۂ حسنِ خود نما معلوم

وہ عشق کی عظمت سے شائد نہیں واقف ہیں — سو حسن کروں پیدا اک ایک تمنا سے

دوسرا نظریہ

پھر گرمِ نوازش ہے ضو مہرِ درخشاں کی — پھر قطرۂ شبنم میں اندازۂ طوفاں ہے

اک غنچۂ افسردہ یہ دل کی حقیقت تھی — یہ موجزنی خوں کی رنگینیٔ پیکاں ہے

تیسرا نظریہ

ایسا بھی ایک جلوہ تھا اس میں چھپا ہوا — اس رُخ پہ دیکھتا ہوں خود اپنی نظر کو میں

نگاہِ شوق کو یارائے سیر و دید نہ ہو — جو ساتھ ساتھ تجلیٔ حسنِ یار نہ ہو

مستی سے تیرا جلوہ خود ارضِ تماشا ہے — آشفتہ نگاہوں کا یہ کیفِ نظر دیکھا

مجنوں کی نظر میں بھی شائد کوئی لیلیٰ ہے — اک ایک بگولے کو دیوانہ بنا آئی

جو تھا نظریہ وہی ہے جس کو اصطلاح سلوک میں وحدت الوجود کہتے ہیں۔

وحدت الوجود کا مسئلہ قدمائے سے لے کر آج تک تمام شعراء باکمال کا موضوعِ سخن رہا ہے اس پامال مضمون پر ندرت بیان سے اصغر نے وہ سحر کاریاں کی ہیں جنکی مثال موجودہ شاعری میں تلاش کرنا سعیٔ لاحاصل ہے ؎

جو نقش ہے ہستی کا دھوکا نظر آتا ہے — پردے پہ مصور ہی تنہا نظر آتا ہے

لو شمع حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے — فانوس کی گردش میں کیا کیا نظر آتا ہے

اے پردہ نشیں ضد کیا ہے چشمِ تمنا کو — تو دفترِ گل میں رُسوا نظر آتا ہے

اس طرح حسنِ دوست ہے بے پردہ آشکار — صدہا حجاب صورت و معنی لئے ہوئے

کچھ غنیمت ہو گئے یہ پردہ ہائے آب و رنگ — حسن کو یوں کون رہ سکتا تھا عریاں دیکھ کر

بند ہو آنکھ اُٹھے منظرِ فطرت کا حجاب — لاؤ اک شاہدِ مستور کو عریاں کر دیں

عمل وہ چیز ہے جو قصد و ارادے سے ظہور میں آئے ارادے کے لئے اختیار ضروری (فلسفہ پیکر) اور اختیار کے لئے ادعائے خودی لازم۔ حالانکہ عبادات کی اصل روح عبدیت اور محویت ہے لہٰذا اعمال و عبادات بے ذوق و سرمستی کا درجہ بلند تر ہے ؎

تھی ہر عمل میں دعوئ ہستی کی معصیت — مستوں نے اور راہ نکالی ثواب کی

سُکر و صحو کا نکتۂ اعتدال ؎

بہت لطیف اشارے تھے چشمِ ساقی کے — نہ میں ہوا کبھی بیخود نہ ہوشیار رہا

بلند نظری

نہ ہوگا مستئ بے مدعا کا راز داں برسوں — وہ زاہد جو رہا سرگشتۂ سود و زیاں برسوں

کچھ اور ہی فضا دلِ بے مدعا کی ہے — دیکھا ہے روزِ وصل و شبِ انتظار کو

کیا دردِ ہجر اور یہ کیا لذتِ وصال — اس سے بھی کچھ بلند ملی ہے نظر مجھے

یہ دین وہ دنیا ہے یہ کعبہ وہ بتخانہ — اک اور قدم بڑھ کر او ہمتِ مردانہ

اسلام اہلِ فطرت ہے

اسلام کے معنی ہیں تفویض یعنی اپنے تمام ارادات حرکات سکنات غرض کہ اپنی تمام ہستی کو رضائے الٰہی کے تابع کر دینا اور بظاہر ہے کہ کائنات کا ایک ذرہ بھی احکام قدرت یعنی قوانینِ فطرت سے مجالِ سرتابی نہیں

رکھتا اس طرح پر تمام موجوداتِ عالم مسلّم ہے۔ فرق یہ ہے صرف اختیار و اضطرار کا
اک دہری وہ بظاہر خدا کا منکر ہے مگر اس کی فطرت انکار نہیں کر سکتی۔ اسی طرح
قرآنِ مجید کا اشارہ ہے۔ افغیر دین اللہ یبغون ولہ اسلم من فی
السموات والارض طوعاً وکرہاً۔

اس نکتہ کو اصغر اپنی زبان میں یوں فرماتے ہیں ؎

مرا وجود ہی خود انقیاد و طاعت ہے — کہ ریشے ریشے میں ساری ہے اک جبین وجود
جینا بھی آ گیا مجھے مرنا بھی آ گیا — پہچاننے لگا ہوں تمھاری نظر کو میں

دنیائے خاموشی میں تخیل کی ساری فضائے بسیط آ جاتی ہے لیکن تکلم اس
بحرِ بے کنار کو محدود کر دیتا ہے۔

فلسفۂ سکوت

اگر خموش رہوں میں تو تو ہی سب کچھ ہے — جو کچھ کہا تو ترا حسن ہو گیا محدود
بیچ حسنِ تعین سے ظاہر ہو کہ باطن ہو — یہ قید نظر کی ہے وہ فکر کا زنداں ہے

پیامِ حیات

کسبِ حیات تو تیری ہر ہر ادا سے ہے — مرنا پسندِ خاطرِ احباب جاں نہیں
اک جہد و کشاکش ہے مستی جسے کہتے ہیں — کفار کا مٹ جانا خود مرگِ مسلماں ہے
اک ایک نفس میں ہے صد مرگِ بلا مضمر — جینا ہے بہت مشکل مرنا بہت آساں ہے

ذوقِ طلب

اٹھا ہے درد رگِ جاں تشنۂ نشتر — مجھے ہے آج تلاشِ کمالِ چارہ گری

مسئلہ فلسفۂ استعداد

مضراب محبت سے اک نغمۂ لاہوتی پھر موجِ ترنم سے بیتاب رگِ جاں ہے
گم صاحبِ تمکیں ہیں افسانۂ محفل میں مجنوں کو وہی لیکن پیغامِ بیاباں ہے

عزمِ استقلال

افتادگانِ عشق نے سر اب تو رکھ دیا اٹھیں گے بھی تو نقشِ کفِ پا لیے ہوئے

انتہائے سوز و گداز کے باوجود انتہائی استغنا ر ع

نہ کی کچھ لذتِ افتادگی میں اعتنا میں نے مجھے دیکھا کیا اٹھ کر غبارِ کارواں برسوں

ایک بلند مرتبہ ہستی ماحول کی تابع نہیں ہوتی بلکہ اپنا ماحول خود پیدا کر لیتی ہے۔

نیازِ عشق کو سمجھا ہے کیا اے واعظِ ناداں
ہزاروں بن گئے کعبے جبیں میں نے جہاں رکھدی

رند جو ظرف اٹھا لیں وہی ساغر بن جائے جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

یہاں تک شعر کے اجزائے چہارگانہ کی نسبت چند اجمالی اشارات تھے اگر کسی شاعر کے کلام میں یہ تمام اوصاف یکجا ہوں تو یہ معراجِ شاعری ہے مگر جس طرح عناصر کے قوام اور ترکیب سے جو مزاج پیدا ہوتا ہے اسی طرح ہر شاعر کا نمونہ کلام بھی مختلف ہوتا ہے اس اختلافِ رنگ سے انکے مدارج کمال میں فرق پیدا نہیں ہوتا بشرطیکہ رنگ خود سفیہانہ اور متبذل نہ ہو جس طرح کسی پہاڑ کی چوٹی سے آبشار کی وسیع چادر کا مرغزار کے دامن میں زور و شور سے گرنا اور اس پر آفتاب کی کرنوں سے عالم نور پیدا ہو جانا بجائے خود ایک حسن مستقل ہے اسی طرح سرو کی دو رویہ قطاروں کے درمیان سے ایک خفیف ترنم کے ساتھ جوئے رواں کا بل کھا کر نکلنا اپنی جگہ پر

ایک نغمۂ رنگیں ہے اگر پھول کی پنکھڑی پر آفتاب صبح کی دوشیزہ شعاعوں کا رقص دلآویز ہے تو دامنِ صحرا میں طاؤسِ طناز کا عالم بیخودی میں ناچنا کچھ کم نشاط انگیز نہیں۔ اس طرح سنائی اور مولانا روم۔ فردوسی و نظامی۔ سعدی و حافظ۔ نظیری و عرفی سب کے سب اپنی اپنی قلمرو کے شہنشاہ ہیں لیکن ہر ایک کا طغرائے شاہی مختلف ہے۔ دُور کیوں جائیے۔ اُردو کے موجودہ شعراء میں قومی رجز خوانی کی حیثیت سے ڈاکٹر اقبال اور پاکیزہ تغزل میں اصغر و فانی اپنی اپنی جگہ پر بے مثل ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک کا رنگ جدا ہے۔ ..... شاعری درحقیقت خود شاعر کی باطنی کیفیات کا آئینہ ہوتی ہے۔ جس میں شاعر کے تمام خط و خال صاف طور پر نمایاں ہوتے ہیں۔ بقول اصغر ؎

اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا
اشعار میں سُنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہیں

جنابِ اصغر فطرتاً شدید الاحساس بلند نظر اور صاحبِ وجد و حال ہیں اس لئے ان کا ایک ایک شعر بلندئ خیال، شکوہ الفاظ، رقص ترکیب، جوشِ بیان اور ندرتِ ادا کا ایک دلفریب طلسم ہے۔ اسرار و معارف ان کی شاعری کا وجد و حال اس کی روح ندرتِ ادا اس کی صورت اور جوشِ بیان اُس کا رنگ ہے مثلاً اشعار ذیل ملاحظہ طلب ہیں ؎

کیا فیض بخشیاں ہیں رخِ بے نقاب کی ۔۔۔ ذرّوں میں روح دوڑ گئی آفتاب کی
سرگرم تجلّی ہو اے جلوۂ جانانہ ۔۔۔ اُڑ جائے دھواں بنکر کعبہ ہو کہ بتخانہ
انوار کی بارش ہو اسرار کی ریزش ہو ۔۔۔ ساغر کو جو ٹکرا دو اس گنبدِ مینا سے

خرمنِ گل سے لپٹ کر وہیں مر جاتا تھا | اب کرے کیوں گلہ تنگیٔ داماں کوئی
لذتِ سجدہ ہائے شوق نہ پوچھ | ہائے وہ اتصالِ ناز و نیاز
قلب پر اب تک برستی ہے شعاعِ برقِ طور | خون کے قطروں میں اب تک رقصِ منصوری بھی ہے
نام اُن کا آگیا کہیں ہنگامِ بازپُرس | ہم تھے کہ اڑ گئے صفِ محشر لئے ہوئے
شوق سے ہے ہر رگِ جاں جستجو میں | لے اُڑے گی بوئے پیراہن کہاں

حقیقت یہ ہے کہ غالب اور مومن نے اساتذۂ ایران کے تتبع اور اپنے زورِ طبیعت سے اُردو شاعری میں دو نئے باب اضافہ کئے تھے وہ محض نقشِ اوّل تھے۔ جناب اصغر۔ حکیم مومن خاں مومن کے سلسلۂ تلامذہ میں ہیں اس لئے ان کی شاعری میں حکیم مومن خاں کی بداعت اسلوب اور شگفتگیٔ ترکیب اور غالب کا زورِ بیان اور نکتہ آفرینی شیر و شکر ہو کر ایک نئی صورت میں جلوہ گر ہوئے ہیں جس میں تصوف و عرفان نے تاثیر کی روح پھونکدی ہے انکی شاعری چونکہ نقشِ ثانی ہے اسلئے نقشِ اوّل کی خامیوں سے پاک ہے اس حیثیت سے اگر ان کو ایک طرزِ خاص کا موجد کہا جائے تو یہ کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ جناب اصغر کا مجموعۂ کلام اُردو کی دنیائے نظم میں بہترین شاہکار ادب ہے جو ہر حیثیت سے اس کا مستحق ہے کہ یونیورسٹی کے اعلیٰ مدارج میں داخل نصاب ہو۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ مردہ پرستی اور کورانہ تقلید کا مرض عوام سے گذر کر خواص تک میں سرایت کر چکا ہے اور کسی زندہ اہلِ قلم کو جو اشتہاری دوا فروشوں کی طرح تاجرانہ زندگی کا خوگر نہو ہمعصروں سے خراجِ تحسین یا اربابِ مناصب سے اعتراف کمال کی توقع رکھنا محض فضول ہے۔ غزلیات اصغر کی سب سے بڑی خصوصیت معیار اخلاق کی بلندی ہے آپکو تلاش سے بھی ایک شعر کلامِ اصغر میں ایسا نہیں مل سکتا جو

اعلیٰ ترین معیار تہذیب سے فروتر ہو۔ وصل و ہجر۔ سوز و گداز، حسرت و یاس، جوش و وارفتگی۔ مسرت و انبساط، غرضیکہ ہر طرح کے جذبات نظم کیے گئے ہیں لیکن کہیں بھی سفیہانہ شوخی، عامیانہ ابتذال، غلامانہ دنائت اور منافقانہ تصنع کا شائبہ تک نہیں اور میرے نزدیک افادیت شاعری کے لئے اسی قدر کافی ہے اس سے متجاوز ہونے کے بعد شاعر، واعظ بن جاتا ہے۔ موجودہ دَور سے کچھ بیشتر شاعری کی نسبت جو نظریہ تھا اس نے شعراء کو تمام اخلاقی ذمہ داریوں سے آزاد کر دیا تھا بڑے بڑے علماء و زہاد اس خرابات میں آ کر ناچنا فخر سمجھتے تھے۔ اس قابلِ نفرت بے اعتدالی میں ردِّ عمل پیدا کیا اور اب موجودہ دَور میں یہ نظریہ بالکل بدل گیا یہانتک کہ اربابِ نظر کی رائے میں ہر شاعر کا ایک مخصوص صحیفہ، ایک مستقل مذہب، ایک خاص وحی یا پیام ہونا چاہیئے جو اس کے تمام فکر و عمل کا محور ہو یعنی بالفاظ دیگر ہر شاعر کو ایک مختصر سا نبی ہونا چاہیئے۔ میرے نزدیک یہ تفریط بھی گذشتہ افراط کا لازمی نتیجہ ہے اور جسطرح پہلا نظریہ مرکز اعتدال سے متجاوز تھا اسی طرح موجودہ نظریہ بھی صحیح نہیں ہے۔ شاعری ایک فنِ لطیف ہے جس کا تعلق محض حسیات جذبات سے ہے ایک شاعر کی زبان سے حالت تاثر میں جو نغمے نکل جاتے ہیں خود اس کی قلبی کیفیت کا آئینہ ہیں اُس کو اس سے کوئی بحث نہیں ہے کہ خارج میں اسکے نتائج کیا مرتب ہونگے کسی مقصد خارجی کو پیشِ نظر رکھ کے شعر کہنا خود مفہوم شعر کے منافی ہے ایک بلبل ہزار داستاں کو کیا خبر کہ عطار اسکے محبوب کا شربت درد بنا کر دام کھرے کرتے ہیں تو وہ محض عارضِ گل کے رنگ و لطافت کی شیدائی ہے۔ اور صرف ذوقِ نظر اور نغمۂ رنگیں اُس کا انتہائی نصب العین ہے۔ خالقِ باری اور زینتِ خیال کے کار آمد ہونے میں

کس کو شبہ ہے مگر کیا یہ شاعری ہے دیوانِ داغ۔ اور زہر عشق کی سمیت اخلاق سے کون انکار کرسکتا ہے۔ مگر کیا یہ سچ نہیں کہ جہاں تک نفسِ شاعری کا تعلق ہے، اُردو زبان میں دو بے مثل ہیں اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ میں اس طرح کی شاعری کو اچھا سمجھتا ہوں کہ یہ رنگین سانپ محض عجائب خانوں کی زیب وزینت ہوسکتے ہیں۔ آستین میں پالنے کی چیز نہیں ہیں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ شاعری اگر ادر احساسات سے کامل ہو اور ساتھ ہی مخرب اخلاق نہ ہو بلکہ ضمناً بلندیٔ اخلاق کی روح اسمیں موجود ہو تو کمال شاعری کے لئے اسقدر کافی ہوگا۔ کسی مستقل مسئلہ کی تعلیم کمال شاعری کا جزو لازمی نہیں ہے البتہ اگر شاعر کسی قومی، مذہبی، ملکی، اخلاقی ولولہ سے سرشار ہے تو لازمی طور پر اسکی شاعری میں یہ رنگ نمایاں ہوگا۔ نفس شاعری کی نسبت عموماً اور کلام اصغر کے متعلق خصوصاً جو میری ناچیز رائے تھی اس کا ایک اجمالی خاکہ سطورِ بالا میں پیش کردیا گیا ہے میں اس سے بیخبر نہیں ہوں کہ نکتہ سنجوں کی اصطلاح میں پرگوئی یاوہ گوئی مترادف الفاظ ہیں۔ میں یہ بھی محسوس کررہا ہوں کہ اصغر کے مختصر اور منتخب مجموعۂ کلام پر جو درحقیقت عطر شاعری ہے اسقدر طویل ذیل تبصرہ سخت اَنمل اور بے جوڑ معلوم ہوگا۔ مگر آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنی جانب سے انتہائی ضبط وایثار کی کوشش کی ہے اور بہت سے مباحث کو تشنہ چھوڑ کر آگے بڑھ گیا ہوں۔ بہرحال مجھے امید ہے کہ مقبولیت کی کمی بہت کچھ زیادتی الفاظ کی تلافی کردے گی پھر بھی آخر میں اعتذاراً یہ کہہ کر رخصت ہوتا ہوں

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

مقدمہ سرود زندگی

(از رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو ایم-اے ایل-ایل-ڈی-کے سی-ایس، آئی-پی-سی)

فی زمانہ دنیائے ادب میں جو شہرہ مولوی اصغر صاحب نے حاصل کیا ہے اس سے میں بہت عرصہ سے واقف ہوں، لیکن پچھلے تین چار سال سے جب سے موصوف کا ہندوستانی اکیڈیمی سے تعلق ہوا ہے مجھے خوش نصیبی سے آپ کے علمی مضامین پر غور کرنے اور آپ کے کلام کے سننے کا اکثر موقع ملا ہے، لہٰذا میں جو اس وقت آپ کی نسبت لکھوں گا وہ رسمی نہیں بلکہ ذاتی تجربہ اور واقفیت پر مبنی ہو گا۔ نہ میں شاعر ہوں اور نہ سخن شناسی کا مجھے دعویٰ، میں اس سے بھی بخوبی واقف ہوں کہ ہندوستان میں کسی ایک شاعر کی تعریف کرنا اس کے ہمعصروں سے مخالفت مول لینا ہے لیکن اس قسم کی تنگ نظری اگر کسی حیثیت سے جائز ہو سکتی ہے تو بے لوث خیالات کے اظہار کی خواہش اس سے کہیں زیادہ قدرتی ہے۔

آجکل عام طور پر اخباروں اور رسالوں میں جو قدیم و جدید شعراء کے

بارے میں مضامین نکلتے ہیں ان میں زیادہ تر لفظی مباحثے ہوتے ہیں کسی کے زبان و محاورہ پر اعتراض ہوتا ہے۔ کسی کی ترکیبِ الفاظ پر نکتہ چینی ہوتی ہے۔ اور کسی پر سرقے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ مگر نفسِ سخن پر بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔ صدہا سال سے نقادانِ سخن میں یہ بحث ہوتی رہی ہے کہ صحیح معنوں میں شعر کیا ہے؟ اس سوال کا جواب ٹھیک اصطلاحی رنگ میں دینا آسان نہیں ہے۔ لیکن معمولی آدمی کے نقطۂ نظر سے کچھ عرض کر دینا بیجا نہ ہوگا۔ جب کوئی کلام ہمارے سامنے آتا ہے تو ہم قدرتی طور پر یہ دیکھتے ہیں کہ کیا کہا گیا ہے؟ اور کس طرح کہا گیا ہے؟ جو کچھ کہا گیا ہے ممکن ہے کہ وہ ایک بلند حقیقت ہو لیکن بغیر طرزِ بیان کی خوبی کے اس شعر کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اسی طرز بیان کی چمک دمک بھی بغیر خیالاتِ عالیہ کے شعر کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ مختصر یہ کہ شعر اگر زبان، محاورہ اور بندشِ الفاظ کے لحاظ سے درجۂ کمال پر پہونچ جائے اور اس میں کوئی ایسا اعلیٰ خیال موجود نہ ہو تو جو ہمارے اندر ایک طرح کی ہلچل پیدا کر سکے تو ایسے شعر کو جو چاہیئے کہیئے مگر اس کا شاعری سے تعلق نہیں۔ اگر میری یہ رائے صحیح ہے تو پھر شعر کی تعریف یہ ہے کہ بہترین بات بہترین اسلوب بیان کے ساتھ یا پھر حسنِ تخیل و حسنِ بیان کا مجموعہ۔

ہر ملک میں شاعری زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہی ہے مثلاً انگریزی زبان میں پوپ کی شاعری کا موجودہ انگریزی شعراء سے اگر مقابلہ کیا جائے تو زمین و آسمان کا فرق ملے گا۔ اگر آجکل پوپ ہوتا اور اس قسم کی نظمیں لکھتا جیسی اس کے زمانے میں مقبول ہوئیں تو اس کی کیا قدر ہوتی۔ اسی طرح انیسویں یا بیسویں صدی کے انگریزی شعراء اگر پوپ کے زمانے میں ہوتے اور اپنا موجودہ

کلام پیش کرتے تو اس کا کیا حشر ہوتا۔ اس کلیئے سے اُردو شاعری بھی مستثنیٰ نہیں ہوسکتی اگر آج امانت یا اوران کے قبیل کے شعراء موجود ہوں تو ظاہر ہے کہ ان کا کیا انجام ہو سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ کچھ شاعر دنیا میں ایسے بھی ہوئے ہیں جو اپنے وقت کی رسم شاعری سے آزاد تھے۔ تاہم انکی شاعری کا اثر اس وقت تک قائم رہے گا جس وقت تک انسان میں جذبات و تخیلات کا عنصر موجود ہے۔ بعض شاعر ایسے ہوئے ہیں جن کی نسبت یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ وہ قبل از وقت پیدا ہوئے مثلاً غالب، اس نے خود ہی کہا ہے ؎

کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است

شہرتِ شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدم

شاید اسی خیال کی بنا پر سر محمد اقبال نے بھی اپنی بابت "شاعر فرداستم" کہا۔ غالب کی قدر جو فی زمانہ ہوئی ہے وہ اس کے ہمعصروں میں ہوئی ہے۔ کچھ تو رشک و حسد اور کچھ اس زمانے کی عام پست خیالی کے باعث لوگ غالب کو صحیح طور پر نہ سمجھ سکے۔ عام مشاعرہ پسندوں کا ذکر نہیں۔ اس زمانے میں لوگ صحیح طور پر اُردو ادب کا ذوق رکھتے ہیں ان کو حسن و عشق کے بے جان اور رسمی قصوں کے سُننے کی نہ تاب ہے نہ فرصت۔ تغزل کا رنگ روز بروز بدلتا جا رہا ہے۔ تیس برس پہلے کی غزلوں کا اگر آجکل کی غزلوں سے مقابلہ کیا جائے تو ایک بیّن فرق معلوم ہوگا۔ میں اُردو شاعری میں جدید رنگ پیدا کرنے والے پانچ چھ شعرا کی طرح مولوی اصغر صاحب کو بھی زمانۂ حال کے بہترین نمایندوں میں سمجھتا ہوں۔ لیکن مستقبل میں ان کی رسائیوں کے حدود کیا ہونگے میرے توقعات

بہت زیادہ ہیں اگرچہ اس کا فیصلہ خود مستقبل کے ہاتھ میں ہے۔

شعراء کی سوانح عمری سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ لازم نہیں کہ اگر کوئی شاعر اعلیٰ خیال ہوا ہے تو زندگی میں اس کے افعال بھی اتنے ہی بلند رہے ہوں گے۔ یا اس کو یوں کہئے کہ شاعر کے قول و فعل میں مطابقت ہونا لازم نہیں ہے۔ مگر ایسے شاعر بھی ہوئے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی اور اپنے کلام میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولوی اصغر صاحب کی شاعری ان کی زندگی کا عکس ہے اور زردشتیوں کے قول کے مطابق ان کی "رفتار، گفتار اور کردار میں مطابقت" پائی جاتی ہے۔ میں ان کی نسبت شاعرانہ مبالغہ سے کام نہیں لینا چاہتا، میں نے وقت کی عام عیب بینی و نکتہ چینی کے اندیشہ سے اپنی رائے کو معتدل رکھنے کی انتہائی کوشش کی ہے۔

ہاں تو میں نے اصل شاعری کو ابھی حسنِ تخیل اور حسنِ بیان کا مجموعہ بتایا ہے۔ میں چند اشعار اپنے دعوے کے ثبوت میں یہاں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ اشعار مختلف موضوع و مضامین پر مشتمل ہیں۔ مگر سب پر حسنِ تخیل اور حسنِ بیان کا اثر نمایاں ہے ؎

کبھی یہ فخر کہ عالم بھی عکس ہے میرا
خود اپنا طرزِ نظر ہے کہ دیکھتا ہوں میں

یہ شعر ایک مسلسل نظم کا ہے جس کا عنوان "کیا ہوں میں" ہے اس سوال کے مختلف جوابات مختلف نظریوں کے تحت میں دیئے گئے ہیں اور آخر میں جو جواب دیا گیا ہے وہ صرف ایک بلند مرتبہ شاعر ہی دے سکتا ہے ؎

ترا جمال ہے، ترا خیال ہے، تو ہے
مجھے یہ فرصتِ کاوش کہاں کہ "کیا ہوں میں"

یہ پوری نظم حسنِ تخیل اور حسنِ بیان کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ ناظرین اسے مجموعہ میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

وہ اشعار جو ذہن کے سامنے ایک پُر کیف روحانی فضا پیدا کر دیتے ہیں انھیں رومانی شاعری (Romantic Poetry) کے نام سے پکارنا غالباً بیجا نہ ہوگا۔ اس طرح کے اشعار ظاہر ہے کہ تخیل کی بلندی اور طرزِ بیان کی خوبی کے بغیر تیار ہی نہیں ہو سکتے۔ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

محو کھڑا ہوا ہوں میں حسن کی جلوہ گاہ میں　　اب نہ کہیں نگاہ ہے اب نہ کوئی نگاہ میں
مجاز کیسا کہاں حقیقت ابھی تجھے کچھ خبر نہیں ہے

یہ سب ہے اک خواب کی سی حالت جو دیکھتا ہے سحر نہیں ہے
شمیم گلشن، نسیم صحرا، شعاعِ خورشید موجِ دریا
ہر ایک گرمِ سفر ہے ان میں مرا کوئی ہمسفر نہیں ہے

ماہ و انجم کو تو سرگرمِ سفر سمجھا تھا میں　　یہ تو شب کو سر بسجدہ ساکت و مدہوش تھے

عاشقانہ مضامین ہماری مشرقی شاعری کے مہمات میں داخل ہیں لیکن اُسے ابتذال و فرسودگی سے بچانا شدتِ جذبات کو قائم رکھنا اور اس میں اتنی سنجیدگی پیدا کر دینا کہ شائستہ جماعت کے قابل ہو سکے آسان نہیں ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

لفظ نہیں بیاں نہیں یہ کوئی داستاں نہیں
شرح نیاز و عاشقی ختم ہے ایک آہ میں

عاشقانہ انداز سے حقائق کو بیان کر جانا شاعری کا کمال ہے۔ یہ اشعار پڑھئے اور دیکھئے ؎

بیخودی میں دیکھتا ہوں بے نیازی کی ادا
کیا فنائے عاشقی خود حسن بن جانے میں ہے

کم سے کم حسنِ تخیل کا تماشا دیکھئے
جلوۂ یوسف تو کیا خواب زلیخا دیکھئے

اے تو بہارِ رنگ رنگ اے تو ورائے آب و رنگ
حسن کسی نگاہ میں عشق کسی نگاہ میں

ایک میرا ہی فسانہ ز ازل تا بہ ابد
یوں نہ کرنا تھا مرے سامنے رسوا مجھ کو

کہہ کے کچھ لالہ و گل رکھ لیا پردہ میں نے
مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا رسوا ہونا

عاشقانہ مضامین میں حسنِ بیان کے ساتھ بلند ہمتی اور شریفانہ سوز و گداز کی مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

حسنِ بیان

رقصِ مستی دیکھئے جوشِ تمنا دیکھئے
سامنے لاکر تجھے اپنا تماشا دیکھئے

لالہ و گل کا جگر خون ہوا جاتا ہے
سب سمجھتے ہیں جو نا کام تماشا مجھ کو

ذرے ذرے میں کیا جوشِ ترنم پیدا
خود مگر کوئی نوا ساز محبت میں نہیں

جوشِ بیان ملاحظہ ہو

ہمہ تن ہستیٔ خوابیدہ مری جاگ اٹھی
ہر بنِ مو سے مرے اس نے پکارا مجھ کو

سوز و گداز

وہی بے تابیاں جانے وہی یہ خستگی سمجھے
کہ جس نے آب و گل میں شورشیں بھر دیں محبت کی

متاعِ زیست کیا ہم زیست کا حاصل سمجھتے ہیں
جسے سب درد کہتے ہیں اسے ہم دل سمجھتے ہیں

ابھی سے دل اسی سے زندگیٔ دل سمجھتے ہیں
یہاں حاصل سے بڑھ کر سعیٔ بے حاصل سمجھتے ہیں

بلند ہمتی :-

میں رند بادہ کش بھی بے نیازِ جام و ساغر بھی
رگِ ہر تاک سے آتی ہے کھنچ کر میری قسمت کی

یہاں تو عمر گذری ہے اسی موج و تلاطم میں
وہ کوئی اور ہونگے سیر ساحل دیکھنے والے

کبھی سنتے تھے ہم یہ زندگی ہے وہم و بے معنی
مگر اب موت کو بھی خطرۂ باطل سمجھتے ہیں

یہ مجھ سے سن لے تو رازِ نہاں اسلامی خود بے تسمی جاں
کہاں ہے رہرو میں زندگی ہو کر راہ جب پُر خطر نہیں ہے

میں یہ کہتا ہوں فنا کو بھی عطا کر زندگی
تو کمالِ زندگی کہتا ہے مرجانے میں ہے

ذیل کا شعر ایک طرح کا درسِ بصیرت ہے جسے قدرتاً خشک ہونا چاہیئے تھا۔ مگر طرزِ بیان کی لطافت ملاحظہ ہو ؎

حیک دیک پر مٹا ہوا ہے یہ باغباں تجھ کو کیا ہوا ہے
فریب شبنم میں مبتلا ہے چمن کی اب تک خبر نہیں ہے

یہ مناظر کچھ نہیں ہیں جب نظر ہے مستعار
اپنی آنکھوں سے کسی دن بزمِ امکاں دیکھئے

رندانہ مضامین کے پردے میں کتنی اعلیٰ و لطیف حقیقتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ؎

رند خالی ہاتھ بیٹھے ہیں اُڑا کر جزو و کل
اب نہ کچھ شیشے میں باقی ہے نہ پیمانے میں ہے

غرق ہیں سب علم و حکمت دین و ایماں دیکھئے
کس طرح اٹھا ہے اک ساغر سے طوفاں دیکھئے

میکدے میں زندگی ہے شورِ نوشا نوش سے
مٹ گئے ہوتے اگر ہم جام و مینا دیکھتے

حکیمانہ خیالات کو جن میں جذبات کی شدت و لطافت بھی ہو شعریت کے رنگین و پُر کیف لباس میں پیش کرنا جناب اصغر کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جسے

تقریباً ان کے ہر ناقد نے تسلیم کیا ہے۔ ایک انگریزی ادیب نے بہترین شعر کی یہ تعریف کی ہے کہ "وہ صداقت ہو مگر بہت ہی عجیب" اس نقطۂ نظر سے ان اشعار پر غور کرنے کی ضرورت ہے ؎

دعویٔ دید غلط دعویٔ عرفاں بھی غلط
کچھ تجلّی کے سوا چشمِ بصیرت میں نہیں

عرش تک تو لے گیا تھا ساتھ اپنے حسن کو
پھر نہیں معلوم اب خود عشق کس منزل میں ہے

دیدۂ بے خواب انجم سینۂ صد چاکِ گل
حسن بھی ہے مبتلائے دردِ پنہاں دیکھئے

رسمِ فرسودہ نہیں شایانِ اربابِ نظر
اب کوئی منظر بلند از کفر و ایماں دیکھئے

بوئے گل بن کے کبھی نغمۂ رنگیں بن کے
ڈھونڈ لیتا ہے ترا حسنِ خود آرا مجھ کو

ذرّہ ذرّہ ہے یہاں کا رہروِ راہِ فنا
سامنے کی بات تھی جس کو خبر سمجھا تھا میں

کائناتِ دہر ہے سرشارِ اسرارِ حیات
ایک مستِ آگہی کو بے خبر سمجھا تھا میں

دید کیا نظارہ کیا اس کی تجلّی گاہ میں
وہ بھی موجِ حسن تھی جس کو نظر سمجھا تھا میں

میرے نزدیک اعلیٰ درجے کی شاعری کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ وہ کس طرح کے لوگوں کو متاثر کرتی ہے۔ آجکل حیدر آباد، جامعہ ملّیہ دہلی، لاہور اور علی گڑھ یونیورسٹی کا درجہ اعلیٰ اور سنجیدہ ادب کے لحاظ سے بہت ہی ممتاز ہے۔ حیدر آباد نے "جدید شاعری" میں جناب اصغر کا تذکرہ بہت ہی شاندار طریقے سے کیا ہے۔ جامعہ ملّیہ دہلی نے "اصغر کے سو شعروں کا انتخاب شائع کیا ہے۔ لاہور کے ادبی رسائل ان کا کلام ممتاز حیثیت سے شائع کرتے ہیں۔ علامہ سر اقبال نے اپنی پرائیویٹ چٹھیوں میں ان کے کلام کی تعریف کی ہے، انہیں "جدت و تاثیر" کے قائل ہیں اور اسے اردو ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ فرمایا ہے۔ علی گڑھ

یونیورسٹی نے اُن کے کلام کو یونیورسٹی کے نصاب میں داخل کیا ہے۔ بہرصورت ان تمام مقامات سے کسی نہ کسی صورت میں ان کی شاعری کا اعتراف کیا گیا ہے۔ سب سے آخری اور شاید سب سے بڑا ثبوت ایک ایسی ہستی کا تاثر ہے جس کی جامعیت اور جس کے ادبی کمالات کا اعتراف صرف ہندوستان میں نہیں بلکہ ہندوستان سے باہر بھی کیا جاتا ہے۔ وہ ذاتِ گرامی مولانا ابوالکلام آزاد کی ہے۔ غرض کہ اس اعتبار سے بھی حضرتِ اصغر کا کلام ہمارے دَور کا ایک اعلیٰ ترین شاہکار ہے اور اس کا مستحق ہے کہ آجکل کے بہترین دل و دماغ اس سے لطف اندوز ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوان اس کو پڑھ کر ایک اعلیٰ پرجوش اور پاکیزہ زندگی حاصل کریں گے۔



تقریظ سرودِ زندگی

امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد

احباب میری کوتاہ قلمی سے بے خبر نہیں ہیں۔ خصوصاً تقریظ کے معاملہ میں۔ لیکن بعض تقاضے ایسے ہوتے ہیں جن کی تعمیل کرنی ہی پڑتی ہے۔ ایسا ہی ایک تقاضا ان سطور کی نگارش کا باعث ہوا۔ یہ اگر صاحبِ کلام کا ہوتا تو میں حسب معمول معذرت کر دیتا مگر خود کلام کا تقاضا ہے۔ اور اس کے لئے میرے پاس کوئی معذرت نہیں۔

اُردو شاعری کی موجودہ صف طویل نہیں ہے، اور اگر معیار کی بلندی پوری طرح قائم رکھی جائے تو معدودے چند اصحابِ ذوق سے شمار آگے نہیں بڑھتا۔ انہی اصحابِ ذوق میں مولوی اصغر حسین صاحب اصغر بھی ہیں جن کے کلام کا پہلا حصہ "نشاطِ روح" اور دوسرا حصہ "سرودِ زندگی" کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔

کئی سال کی بات ہے۔ انھوں نے اپنے کلام کا پہلا مجموعہ جو "نشاطِ روح" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ مجھے بھیجا تھا۔ اس وقت تک ان کا کلام میری نظر سے نہیں گذرا تھا۔ چونکہ وقت کی عام ادبی سرگرمیوں کی طرف سے طبیعت مایوسی کی عادی ہو چکی ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر ذہن کسی غیر معمولی دلچسپی کے لئے مستعد نہ تھا۔ میں نے بیدلی سے مجموعہ اٹھایا اور چاہا کہ ورق گردانی کر کے رکھ دوں، لیکن مجھے اس اعتراف میں تامّل نہیں کہ جونہی دو چار شعر نظر سے گزرے میں چونک اُٹھا، اور جوں جوں مطالعہ کرتا گیا، میری تعجب انگیز مسرّت بڑھتی گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ وقت کی عام مایوسیاں مستثنیات سے خالی نہیں ہیں۔

میں وقت کی شاعری سے اس اندازِ کلام کا متوقع نہ تھا ؎

کیا کہیے جاں نوازیٔ پیکانِ یار کو — سیراب کر دیا دلِ منّت گزار کو
جوشِ شباب، نشۂ صہبا ہجومِ شوق — تعبیر یوں بھی کرتے ہیں فصلِ بہار کو

صحنِ حرم نہیں ہے یہ کوئے بتاں نہیں — اب کچھ نہ پوچھیے کہ کہاں ہوں کہاں نہیں
مدّت ہوئی کہ چشمِ تحیّر کو ہے سکوت — اب جنبشِ نظر میں کوئی داستاں نہیں
سارا حصولِ عشق کی ناکامیوں میں ہے — جو عمر رائیگاں ہے، وہی رائیگاں نہیں
فطرت سنا رہی ہے ازل سے اسی طرح — لیکن ہنوز ختم مری داستاں نہیں

یہ عشق نے دیکھا ہے، یہ عقل سے پنہاں ہے — قطرہ میں سمندر ہے، ذرّہ میں بیاباں ہے

پھر گرم نوازش ہے ضو مہر درخشاں کی
ہر قطرۂ شبنم میں ہنگامۂ طوفاں ہے

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا
جب آنکھ کھلی دیکھا، اپنا ہی گریباں ہے

آغوش میں ساحل کے کیا لطفِ سکوں اسکو
یہ جان ازل ہی سے پروردۂ طوفاں ہے

گم صاحبِ تمکیں ہے افسانۂ محفل میں
مجنوں کو یہی لیکن پیغام بیاباں ہے

بیچ حُسنِ تعیّن سے ظاہر ہو کر باطن ہو
یہ قید نظر کی ہے، وہ فکر کا زنداں ہے

اک ایک نفس میں ہے صد مرگ بلا مضمر
جینا ہے بہت مشکل، مرنا بہت آساں ہے

خستگی نے کر دیا اسکو رگِ جاں سے قریب
جستجو ظالم کہے جاتی تھی "منزل دُور ہے"

آنکھ ہو جب محوِ حیرت تو نمایاں ہے وہی
فکر ہو جب کار فرما تو وہی مستور ہے

دیکھتا ہوں میں کہ ہے بحرِ حقیقت جوش پر
جو حباب اُٹھ اُٹھ کے مٹتا ہے سرِ منصور ہے

راز کی جستجو میں مرتا ہوں
اور میں خود ہوں ایک پردۂ راز

میں نے یہ مجموعہ بے دلی کے ساتھ اُٹھایا تھا۔ لیکن جب رکھا تو اس اعتراف کے ساتھ رکھا کہ اُردو میں ایک شاعر موجود ہے جس کی موجودگی سے میں اسوقت تک بے خبر تھا۔"

میری نگاہ نکتہ چینی میں کمی نہیں کرتی۔ میں معیار کی پستی پر کسی طرح اپنے آپ کو راضی نہیں کر سکتا۔ اہلِ فن کو مجھ سے خوش گمانی کی نہیں، بد گمانی کی شکایت ہے۔ تاہم میں محسوس کرتا ہوں، جس شاعر کے کلام میں حسب ذیل اشعار موجود ہوں، اُس کی شاعری کی وقعت بحث و اثبات کی محتاج نہیں ہو سکتی ہے

قہر ہے تھوڑی سی بھی غفلت طریقِ عشق میں
آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا

انتہا کیف کی افتادگی و پستی ہے
مجھ سے کہتا تھا یہی دُردِ تہِ جام ابھی

نیازِ عشق کو سمجھا ہے کیا اے واعظِ ناداں
ہزاروں بن گئے کعبے جبیں میں نے جہاں رکھدی

پہلے ہستی کی جستجو ہے ضرور
پھر جو گُم ہو تو جستجو نہ کرے

نہ یہ شیشہ، نہ یہ ساغر، نہ یہ پیمانہ بنے
جانِ میخانہ، تری نرگسِ مستانہ بنے

کار فرما ہے فقط حُسن کا نیرنگِ کمال
چاہے وہ شمع بنے، چاہے وہ پروانہ بنے

رند جو ظرف اُٹھالیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں، وہی میخانہ بنے

پرتوِ رُخ کے کرشمے تھے سرِ راہ گذر
ذرّے جو خاک سے اُٹھے وہ صنم خانہ بنے

رُوئدادِ چمن سُنتا ہوں اس طرح قفس میں
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

قیدِ قفس میں طاقتِ پرواز اب کہاں
رعشہ سا کچھ ضرور ابھی بال و پر میں ہے

تھا حاصلِ نظارہ فقط ایک تحیّر
جلوے کو کہے کون کہ اب گُم ہے نظر بھی

حسرتِ ناکام میری، کام سے غافل نہیں
اک طریقِ جستجو یہ دردِ مہجوری بھی ہے

میں تو ان مجبوریوں پر بھی سراپا دید ہوں
اسکے جلوے کی ادا اک شانِ مستوری بھی ہے

میری محرومی کے اندر سے یہ دی اس نے صدا
قرب کی راہوں میں میری راہ اک دوری بھی ہے

قلب میں ابتک تڑپتی ہے شعاعِ برقِ طُور
خون کے قطروں میں ابتک رقصِ منصوری بھی ہے

جس پہ میری جستجو نے ڈال رکھے تھے حجاب
بیخودی نے اب اسے محسوس و عریاں کر دیا

بہائے درد و الم درد و غم کی لذّت ہے
وہ ننگِ عشق ہے جو آہ ہو اثر کے لئے

پردۂ دہر کچھ نہیں ایک ادائے شوخ ہے　　خاک اٹھا کے ڈال دی دیدۂ امتیاز میں

پاتا نہیں جو لذتِ آہِ سحر کو میں　　پھر کیا کروں گا لے کے الٰہی اثر کو میں

نظامِ دہر کیا؟ بیتابیوں کے کچھ مظاہر ہیں　　گدازِ عشق گویا روح ہے اجزائے عالم کی
شعاعِ مہر خود بیتاب ہے جذبِ محبت سے　　حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ شبنم کی

حل کر لیا مجاز و حقیقت کے راز کو　　پائی ہے میں نے خواب میں تعبیر خواب کی

میں ہوں ازل سے گرمِ رہِ عرصۂ وجود　　میرا ہی کچھ غبار ہے دنیا کہیں جسے

اسرارِ حقیقت کو اک ایک سے پوچھا ہے　　ہر نغمۂ رنگیں سے ہر شاہدِ زیبا سے

خروشِ آرزو ہو نغمۂ خاموشِ الفت بن　　یہ کیا اک شیوۂ فرسودۂ آہ و فغاں برسوں
نہ کی کچھ لذتِ افتادگی میں اعتنا میں نے　　مجھے دیکھا کیا اٹھ کر غبارِ کارواں برسوں

گم کر دیا ہے دید نے یوں سر بسر مجھے　　ملتی ہے اب انھیں سے کچھ اپنی خبر مجھے
کیا دردِ ہجر اور یہ کیا لذتِ وصال　　اس سے بھی کچھ بلند ملی ہے نظر مجھے

شعورِ غم نہ ہو فکرِ مآلِ کار نہ ہو　　قیامتیں بھی گزر جائیں ہوشیار نہ ہو

قربان ترے میکش، ہاں اے نگہِ ساقی　　تو صورتِ مستی ہے، تو معنیِ میخانہ

دوسرے مجموعے یعنی "سرودِ زندگی" کا بھی یہی عالم ہے اصحابِ ذوق تسلیم کریں گے کہ یہ اشعار معیار میں ڈھلے ہوئے اور نقد و نظر سے بے پروا ہیں ؎

عالم پہ ہے اک سکونِ بیتاب　　یا عکس ہے میری خامشی کا
ہاں سینہ گلوں کی طرح کر چاک　　دے مر کے ثبوت زندگی کا

تو بہت سمجھا تو کہ گزرا فریبِ رنگ و بو　　یہ چمن لیکن اسی کی جلوہ گاہِ ناز ہے

گوشہ گوشہ علم و حکمت کا ہے سب دیکھا ہوا
یہ غنیمت ہے درِ میخانہ اب تک باز ہے
عام ہے وہ جلوہ لیکن اپنا اپنا طرزِ دید
میری آنکھیں بند ہیں اور چشمِ انجم باز ہے

اے کاش میں حقیقتِ ہستی نہ جانتا
اب لطفِ خواب بھی نہیں احساسِ خواب میں
میری نوائے درد پہ کوئی صدا نہیں
بکھرا دیئے ہیں کچھ مہ و انجم جواب میں
کیوں شکوہ سنج گردشِ لیل و نہار ہوں
اک تازہ زندگی ہے ہر اک انقلاب میں

تیری ہزار برتری تیری ہزار مصلحت
میری ہر اک شکست میں میرے ہر اک قصور میں
بس اتنے پر ہوا ہنگامۂ دار و رسن برپا
کہ لے آغوش میں آئینہ کیوں مہرِ درخشاں کو
سنا ہے حشر میں شانِ کرم بیتاب نکلے گی
لگا رکھا ہے سینہ سے متاعِ ذوقِ عصیاں کو

برگِ گل کے دامن پر رنگ بن کے جمنا کیا
اس فضائے گلشن میں موجۂ صبا ہو جا!
تو ہے جب پیام اس کا پھر پیام کیا تیرا
تو ہے جب صدا اسکی آپ بے صدا ہو جا!
آدمی نہیں سنتا آدمی کی باتوں کو
پیکرِ عمل بن کر غیب کی صدا ہو جا!
قطرۂ تنک مایہ بحرِ بیکراں ہے تو
اپنی ابتدا ہو کر اپنی انتہا ہو جا!

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا
وہ شورشیں نظامِ جہاں جنکے دم سے ہے
جب مختصر کیا انھیں انساں بنا دیا

اس سے بڑھ کر کوئی بے راہ روی کیا ہو گی
گامِ پُر شوق کا منزل سے شناسا ہونا

یا تو خرد کو ہوش کو مستی دے بے خودی سکھا
یا نہ کسی کو ساتھ لے اسکے حریم ناز میں
شورشِ عندلیب نے روح چمن میں پھونکدی
ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خوابِ ناز میں

بہت سمجھے ہوئے ہے شیخ راہ و رسم منزل کو
یہاں منزل کو بھی ہم جادۂ منزل سمجھتے ہیں

نمودِ جلوۂ بے رنگ سے ہوش اسقدر گم ہیں
کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

جلوۂ ذوق پرستش گرمیٔ حسنِ نیاز
ورنہ کچھ کعبہ میں رکھا ہے نہ بت خانے میں ہے
میں یہ کہتا ہوں فنا کو بھی عطا کر زندگی
تو کمالِ زندگی سمجھا ہے مر جانے میں ہے

بنا لیتا ہے موجِ خونِ دل سے اک چمن اپنا
وہ پابندِ قفس، جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے
یہاں کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

یہ مجھ سے سُن لے تو رازِ پنہاں سلامتی خود ہے دشمنِ جاں
کہاں سے رہرو میں زندگی ہو کہ راہ جب پُر خطر نہیں ہے

تڑپنا ہے، نہ جلنا ہے، نہ جل کر خاک ہونا ہے
یہ کیوں سوئی ہوئی ہے فطرتِ پروانہ برسوں سے

عکس کس چیز کا آئینۂ حیرت میں نہیں
تیری صورت میں ہے کیا جو مری صورت میں نہیں
ذرّے ذرّے میں کیا جوشِ ترنم پیدا
خود مگر کوئی نوا ساز محبت میں نہیں

میں نے سرسری نظر ڈالتے ہوئے بعض اشعار پر نشان کر دیا تھا جو یہاں نقل کر دیئے گئے ہیں ورنہ ارباب نظر کے لئے اس سے بہت زیادہ سرمایۂ ذوق موجود ہے۔

ان سطور کی نگارش سے مقصود انتقاد و تبصرہ نہیں ہے۔ اس کام کے لئے اور لوگ موجود ہیں۔ مقصود یہ تھا کہ اپنا تاثر ظاہر کر دوں۔ محاسن کا حق ہے کہ ان کی شہادت دی جائے۔ میں نے اصغر صاحب کے کلام میں حُسن و خوبی پائی میرا فرض تھا کہ اس کی شہادت دوں۔

سرودِ زندگی میری نظر میں

وصی احمد سندیلوی

اصغر مرحوم کی "سرودِ زندگی" دراصل ان کی زندگی کا نچوڑ ہے۔ اس سے پہلے اُن کی "نشاطِ روح" بازار میں آچکی تھی۔ ان کے نفیس کلام نے اُردو شاعری میں قنوطیت، درجائیت سے ہٹ کر رقص وسرود کا بازار گرم کیا۔ آہ وزاری، نالۂ وبکا، یاس وحرماں جو اُردو شاعری کا اوڑھنا بچھونا بن گیا تھا جس نے دلوں پر سکوت و جمود طاری کر رکھا تھا۔ جہاں زندگی پھیکی اور بے کیف نظر آنے لگی تھی۔ وہاں کانوں میں ایک ایسی لے آئی جس نے زندگی کی خوابیدہ تمناؤں کو بیدار کیا یاس وحرماں کی جگہ جوش وعمل کا جذبہ پیدا ہوا، ناکامی ونامرادی میں یاسیت کی جگہ فکرِ فردا نے لی تو شعراء ونقاد نے اس طرف توجہ کی کہ یہ لے کدھر سے آرہی ہے۔ لوگوں نے دیکھا کہ یہ ایک مولوی کی آواز ہے جس نے اچھی گھنی داڑھی رکھ رکھی ہے۔ جس کے سر پر پٹے ہیں۔ جس نے دیدہ زیب لباس پہن رکھا ہے، جس کی سادگی وپرکاری میں دلکشی ورعنائی ہے۔ جس کی رفتار وگفتار میں یکسانیت ہے۔ جس کے خدوخال سے مہرو

محبت کی بو آتی ہے۔ جس کی آنکھوں میں چمک دمک ہے جس کے چہرے پر وقار و جمال کی تابناگی ہے۔ آیئے آپ بھی ان سے ملئے۔

آپ اصغر حسین اصغر ہیں۔ ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں راہی ملکِ عدم ہوئے۔ ہمارے بہت سے بزرگوں نے ان کو اچھی طرح دیکھا ہوگا۔ اور بہت سے ایسے بھی ہونگے جنھوں نے اُن سے شرفِ ملاقات بھی حاصل کی ہوگی۔ لیکن بہت سے ہمارے جیسے بھی ہونگے جنھوں نے اصغر گونڈوی کا نام صرف کتابوں میں پڑھا ہوگا یا دوسروں سے سُنا ہوگا۔ اصغر گونڈوی کو راہی ملکِ عدم ہوئے ۲۳-۲۴ سال ہوئے لیکن آج بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ابھی زندہ ہیں اور ہم لوگوں میں ہنس بول رہے ہیں۔ اپنی نشاط روح سرودِ زندگی کی تانوں سے ہمارے مُردہ دلوں میں نشاطی و انبساطی کیفیت پیدا کر رہے ہیں۔ اصغر مرحوم۔ اصغر گونڈوی کے نام سے مشہور ہیں لیکن در اصل ان کا آبائی خاندان گورکھپور رہا ہے وہیں کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔

باپ قانون گو تھے۔ اس زمانہ میں ہندوستانی کے لئے قانون گوئی بھی فخر و منزلت کا درجہ رکھتی تھی مگر گھریلو پریشانیاں کچھ ایسی لاحق تھیں کہ جنھوں نے ان کو مروجہ درسی تعلیم سے باز رکھا پھر بھی بڑے ذہین تھے۔ اپنی خداداد صلاحیتوں سے اُنھوں نے عربی، فارسی، اُردو اور انگریزی میں مہارت حاصل کی۔ اسکولی تعلیم تو صرف نویں درجہ تک ہی تھی۔ لیکن کسبی استعداد کہیں آگے بڑھ چکی تھی۔ باپ نے ملازمت کا بیشتر حصّہ گونڈہ میں بسر کیا۔ اسی وجہ سے ان کے نام کے ساتھ گونڈوی مشہور ہوا۔ خود بھی گورکھپور پر گونڈہ کو ہی ترجیح دی۔ گورکھپور میں ان کا خاندان مولویانہ تھا۔ انگریزی تعلیم اور انگریزی معاشرت کو اس خاندان کے لوگ اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے

تھے۔ فقیر منش اور پرانے رسم ورواج کے پابند تھے۔ ان کے رہن سہن اور طرزِ معاشرت میں پیری مریدی اور مولویت ملتی تھی۔ خود بھی منگلور ضلع سہارنپور کے ایک صوفی بزرگ شاہ عبدالغنی صاحب کے مرید تھے جن کی تعلیم و تربیت نے ان میں حکمت و بصیرت پیدا کی۔ خیالات و جذبات میں فلسفہ و تصوّف کو جگہ دی۔ جن سے ان کے رہن سہن اور طرزِ معاشرت میں نفاست و پاکیزگی کو فروغ ملا۔

جہانتک انسانی فطرت کا خاصہ اور جوانی کا تقاضہ ہے اس سے یہ بے بہرہ نہ تھے۔ ایک نوجوان انسان کے ناطہ ان میں بھی وہی جذبات کارفرما تھے، جو دوسروں میں ہوتے ہیں۔ جمالیاتی ذوق، حسن و عشق کی کشمکش اور جودتِ طبع سے ان کا دل بھی خالی نہ تھا۔ ان کی شاعری میں شباب کی رنگینیاں اور حسن و عشق کی معاملہ بندیاں اگر ایک طرف ہیں تو دوسری طرف فلسفہ و تصوف اور حقائق و معارف کے اسرار و رموز بھی پوری طرح جلوہ گر ہیں۔ کہتے ہیں ؎

اصغرؔ غزل میں چاہیئے وہ موجِ زندگی	جو حسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں
رند جو ظرف اٹھالیں وہی ساغر بن جائے	جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے
اسکی نگاہِ ناز نے چھیڑا کچھ اس طرح	ابتک اچھل رہی ہے رگِ جانِ آرزو
کہاں ہے خرد کہاں ہے نظام کار اس کا	یہ پوچھتی ہے تری نرگسِ خمار آلود
معاملہ نگہِ ناز سے ہے اے اصغرؔ	بہانۂ الم و حیلۂ قضا معلوم

اصغرؔ مرحوم کا کلام کیا ہے اور کیسا ہے اس پر لوگوں کی متضاد رائیں ہیں۔ کسی نے ان کی شاعری کو جھاڑ پھونک کہا ہے، تو کسی نے ان کے جذبات و خیالات کو پیرانہ سالی سے تشبیہ دی ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ انسانی خیالات میں ہمیشہ تضاد رہا

ہے۔ شاعر اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اسکے جذبات وخیالات میں کلی طور پر ہمہ گیری نہیں ہوتی ہے۔ وقتی اور سماجی تقاضے اس پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں۔ ماحول اور معاشرت کا اثر اس کے احساسات اور محسوسات پر پڑتا رہتا ہے۔ جن لوگوں کے جذبات وخیالات شاعر کے جذبات وخیالات سے مطابقت کرتے ہیں ان کو تو اس کی شاعری میں لطف ملتا ہے۔ معنیٰ آفرینی اور نکتہ سنجی سے وہ ہمکنار ہوتے ہیں لیکن ایک ایسا شخص جو شاعر کے جذبات وخیالات سے کوئی سروکار نہ رکھتا ہو اس بھینس کے مانند ہے جس کے آگے بین بجائی جارہی ہو۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کو بال کی کھال نکالنے میں ہی مزہ آتا ہے۔ ایسے لوگوں کے متعلق کچھ کہنا بے سود ہے انصاف کا تو یہ تقاضہ ہے کہ جب کسی شاعر کی شاعری کو کسوٹی پر کسا جائے، تو اسکے زمان ومکان پر بھی غور کر لیا جائے کہ وہ کن حالات کے تحت اپنے جذبات کو قلمبند کر رہا ہے۔

جہانتک اصغر مرحوم کی زندگی کا تعلق ہے وہ اس بات کی صریح غمازی کرتی ہے کہ ان کے ابتدائی حالات ہمیشہ مالی پریشانیوں سے دوچار رہے ہے۔ حصولِ علم کا جذبہ ان کے اندر پوری طرح کارفرما تھا۔ لیکن مالی وسائل ایسے نہ تھے کہ وہ مروجہ تعلیم میں کوئی امتیاز حاصل کر سکتے۔ انھوں نے جو کچھ پڑھا اور سیکھا اپنے ذوق ولگن سے اسکول میں تو انٹرنس بھی نہ پاس کر سکے۔ کثرت مطالعہ ہی ان کا رفیق کار رہا، جس نے ان کے تخیل پر جلا کی۔ ذوقِ شاعری ان کو فطرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا تھا۔ کثرت مطالعہ ہی ان کا رفیقِ کار رہا تھا۔ جس نے ان کے تخیل کو بلند کیا۔ طرزِ معاشرت نے اُن میں حقیقت ومعرفت کے دریچے کھولے۔ قناعت اور اعتدال پسندی نے ان کو بیجا حرص سے وآز سے باز رکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا

کہ ان کی زندگی ہمیشہ شور و شر سے پاک رہی اور طمانیت قلب ہمیشہ ان کی رفیق کار رہی۔ ان کے قلبی سکون نے ان کو پریشانیوں کے موقع پر بھی اولوالعزم بنائے رکھا۔ پیری مریدی اور حال وقال نے ان کو نغمہ و سرود سے لطف اندوز کیا۔

ان کی شاعری میں جہاں ہم کو فلسفہ و حکمت کی باریکیاں، تخیل کی بلندیاں اور شباب کی رنگینیاں ملتی ہیں وہیں کردار میں نفاست، اخلاق میں مروّت اور نظر میں وسعت بھی ان کی رفتار و گفتار میں یکسانیت ہے جو دوسروں میں بہت کم نظر آتی ہے۔ اُنھوں نے ایک ایسے دور میں آنکھ کھولی جب زمانہ تیزی سے ترقی کر رہا تھا، پرانی قدریں مٹ رہی تھیں۔ نئے افکار و خیالات دلوں میں جاگزیں ہو رہے تھے، غم عشق کی جگہ غم روزگار جگہ پکڑ رہا تھا۔ لوگ حسن و عشق کے قصوں سے بڑھ کر زندگی کو ادب سے ہمکنار کرنے کی فکر میں تھے۔ داخلیت پر خارجیت کا رنگ بھی گہرا ہو چکا تھا۔ اصغر مرحوم نے پہلے پہل جب اس کوچہ میں قدم رکھا تو پامال و فرسودہ زمینیں ہاتھ لگیں۔ لیکن ان سے جلد ہی دل اُچاٹ ہو گیا۔ بقول غالبؔ "کچھ اور چاہیئے وسعت میرے بیاں کے لئے۔" غزلیات میں نظم نگاری کا انداز پیدا کیا۔ شاعری کی اصناف سخن میں غزل ہی ایک ایسی صنف رہی ہے جس نے بڑے چھوٹے، امیر غریب، رند و پارسا ہر ایک کا دل اپنایا ہے۔ اصغرؔ نے بھی غزل ہی کو اپنا غمگسار بنایا لیکن احساس، جدّت و ندرت کے ساتھ۔ ملکی سماجی اور معاشرتی مسائل کو ردو ھو کر نہیں ہنسی خوشی سے طے کرنے کا ڈھنگ نکالا۔ غزلیات میں نظم نگاری کا انداز پیدا کر کے غزل گو شعراء پر اس اعتراض کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا کہ اُن میں مسلسل نظم نگاری کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے۔ سرودِ زندگی

کی غزلیات نظم نگاری کا اچھا نمونہ ہیں۔ اپنے زماں و مکاں کے لحاظ سے غزل گوئی میں جو مرتبہ اصغرؔ مرحوم نے حاصل کیا۔ اُردو ادب کی تاریخ اسکو کبھی فراموش نہیں کر سکتی ہے۔

نیازؔ مرحوم کا یہ کہنا کہ "انکی شاعری معیاری نہ تھی بلکہ شاعری کا بڑا حصہ جو تصوّف و روحانیت سے وابستہ ہے بالکل درود شریف کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے"۔ مناسب نہیں ہے یہ تو اپنی اپنی پسند ہے۔ کسی شاعر کو لے لیجئے اسکے کلام میں کہیں نہ کہیں فنی کمزوریاں، عروضی غلطیاں، اور معائب و محاسن ضرور ملیں گے پھر اصغرؔ مرحوم کے پورے کلام میں عروضی اور فنی کمزوریاں تلاش کرنا کیا معنی؟ جبکہ انکی علمی استعداد نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ یہ مانا کہ شاعری کے کچھ اصول ہیں ان ہی اصول کے تحت شاعر شعر کہتا ہے لیکن لبا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ شاعر شعری قید بند سے بالکل آزاد ہو کر اپنے جذبات اور محسوسات کی عکاسی کرتا ہے کیونکہ شاعری دلی جذبات کا اظہار ہے اگر اسکے دل میں جذبات نہیں ہیں، گرمی نہیں ہے، تڑپ نہیں ہے، محسوسات اور احساسات نہیں ہیں تو شاعری بیکار ہے۔ ایسے کلام سے کسی کو کوئی لطف اور مزہ نہیں مل سکتا ہے۔ الفاظ کے تانے بانے اور گورکھ دھندے سے جاذبیت اور کشش نہیں پیدا ہو سکتی ہے۔ آورد تو ہو سکتا ہے لیکن آمد کا کوسوں پتہ نہ ہوگا۔ ایسی صورت میں تصنّع حقیقت پر کیوں کر فوقیت حاصل کرے گا۔ آتشؔ و ناسخؔ کے کلام میں پوری طرح جلوہ گر ہے لیکن جذبات آتشؔ کے کلام میں، جو دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

اصغرؔ مرحوم کی وہ شاعری جو تصوّف، فلسفہ اور روحانیت سے متعلق ہے ہو سکتا ہے کہ نقاد کو اسکے اندر وہ گرمی نہ ملی ہو جس سے اسکے بوڑھے جذبات میں ٹیس

اٹھتی اور اسکی جوانی پھر عود کر آتی لیکن حقیقت تو یہ ہے۔ بہ قول اصغر ؎

الٰہی کون سمجھے میری آشفتہ مزاجی کو — قفس میں چین آتا ہے نہ راحت ہے نشیمن میں

جنونِ عشق میں ہستیٔ عالم پر نظر کیسی — رخِ لیلیٰ کو کیا دیکھیں گے محمل دیکھنے والے

صنم کدے میں تجلی کی تاب مشکل ہے — حرم میں شیخ کو محوِ نماز رہنے دے

شمیمِ گلشن، نسیمِ صحرا، شعاعِ خورشید، موجِ دریا — ہر ایک گرمِ خرام یہاں میں مرا کوئی ہمسفر نہیں ہے

لباسِ زہد ہو پھر کاش نذرِ آتشِ صہبا — کہاں کھوئی ہوئی ہے جرأتِ رندانہ برسوں سے

تجھ ہی سے اس جہاں میں ہے بنا آئین و حکمت کی — کہ سب مے کی بدولت اصطلاحِ جام و مینا ہے

ڈاکٹر فاروقی صاحب کا یہ کہنا کہ "ممکن ہے اصغر جوان رہے ہوں لیکن ان کی شاعری پیرانہ سالی ہی رہی انکی روحانیت کچھ ویران ہی سی ہے اور انکی محبت بھی بے رونق ان کے تخیل میں رنگینی ہے لیکن جذبات میں گرمی نہیں۔

سوچنے کی بات ہے کہ اصغر مرحوم نے نہ تو کبھی کسی کو دل دیا اور نہ تو کبھی کسی کے فراق میں آہ و بکا کی۔ ان کا عشق جو تھا بھی وہ کامیاب رہا۔ اوائل عمری میں اگر ان کو کسی سے لگاؤ رہا بھی تو کبھی وہ عشق و جنون کے نتیجہ پر نہیں پہنچا۔ اس میں ان کو ناکامی و نامرادی کا منھ نہیں دیکھنا پڑا۔ وہ ایک سیدھے سادے انسان تھے ان کا ماحول بالکل مشرقی تھا جس پر مذہب کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ ایسے شخص سے یہ توقع کرنا کہ ان کو حسن و عشق کے رازہائے سربستہ سے کماحقہٗ واقفیت ہوگی یا ان کے وارداتِ قلبی عشقیہ رموز سے پوری طرح ہمکنار ہوں گے لاحاصل ہے۔ جوانی کے تقاضوں نے اور کتابی تجربات نے جن رموز سے ان کو آشنا بھی کیا اُن پر بھی اخلاق و پاکیزگی اور شرم و حیا کی ہمیشہ گرفت رہی۔ بے کیفی و سرمستی میں بھی اخلاقی دامن کو داغدار نہ ہونے دیا۔ پینے پلانے سے

باوجود بھی اپنے قدموں کو لڑکھڑانے سے بچائے رکھا۔ جذبات میں گرمی جب ہی پیدا ہوتی ہے۔ جب انُ ہی حالات سے انسان دوچار ہو۔ رندی و مستی جب ہی اپنا اثر کرتی ہے جب جام و مینا بھی پاس ہو۔ لیکن جب یہ سوچا جائے کہ بن پیے شرابی حالت پیدا ہو تو عبث ہے۔ جہاں تک انسانی جذبہ کا تعلق ہے اصغر مرحوم کے اندر جوانی کا تخیل تو ہے۔ لیکن وہ حرارت نہیں جو ایک عاشق جانباز میں ہوتی ہے وہ ایک مولوی تو ہیں لیکن نرے مولوی بھی نہیں، صوفی تو ہیں لیکن تارک الدنیا بھی نہیں۔ عابد و زاہد تو ہیں لیکن فنا فی اللہ بھی نہیں۔ ایسے شخص سے یہ امید کرنا کہ اس کے کلام میں بھرپور شباب کی رنگینی ہو نگی یا حقائق و معرفت کے رازہائے سربستہ کا انکشاف ہوگا۔ بے معنی ہے۔ ان کو ان کے معیار پر اگر پرکھا جائے اور زماں و مکاں کے ساتھ ان کی استعداد و اکتساب کا لحاظ بھی رکھا جائے تو ایک قاری اور نقاد کو ان کے کلام میں جوانی کا تخیل، حسن و عشق کی کشمکش، نالہ و فریاد کی آہ و بکا اور جذبات کا درد بسبت بخوبی ملے گا۔ تلاش کے لئے اپنا اپنا ذوقِ نظر چاہیئے۔ محبت کیا ہے؟ ان کے الفاظ میں ملاحظہ ہو ؎

میں کیا کہوں کہاں ہے محبت کہاں نہیں　　رگ رگ میں دوڑی پھرتی ہے نشتر لئے ہوئے

کچھ شعر اور ملاحظہ ہوں ؎

اسیرانِ بلا نے آہ کچھ اس درد سے کھینچی　　نگہباں چیخ اُٹھے ہل گئی دیوارِ زنداں کی
تمتما اُٹھے وہ عارض میرے عرضِ شوق پر　　حسن جاگ اُٹھا ہے جب عشق نے فریاد کی
وہ شوخ بھی معذور ہے مجبور ہوں میں بھی　　کچھ فتنے اُٹھے حسن سے کچھ حسنِ نظر سے

یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کے کلام میں سوز و گداز بھی ہے اور ولولہ انگیزی بھی

روحانیت بھی ہے اور واردات قلبی بھی، محبّت کی رنگینیاں بھی اور جوانی کے تقاضے بھی۔ نہ تو بیہودہ رنگینیت اور عریانیت ہے اور نہ فلسفہ و حکمت کی دقاقتی ہی۔ بقول اصغرؔ

نہ میں دیوانہ ہوں اصغرؔ نہ مجھکو ذوقِ عریانی ۔ کوئی کھینچے لئے جاتا ہے خود جیب و گریباں کو

اصغرؔ غزل میں چاہیئے وہ موجِ زندگی ۔ جو حسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں

جو مجھ پر گزری ہے شب بھر وہ دیکھے ہمدم ۔ چمک رہا ہے مژہ پر ستارۂ سحری

علم و حکمت کی تمنا ہے نہ کونین کا غم ۔ میرے شیشے میں ہے، باقی مئے گلفام ابھی

رند جو ظرف اٹھالیں وہی ساغر بنجائے ۔ جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

لیکن اصغرؔ ہار ماننے والے نہ تھے۔ مشکلوں سے وہ گھبراتے نہ تھے، بلکہ بقول غالبؔ "مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں" اسی خیال کو وہ اس طرح قلمبند کرتے ہیں ؎

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے ۔ اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

ہے آرزو کہ آئے قیامت ہزار بار ۔ فتنہ طرازیِ قدِ رعنا لئے ہوئے

جگرؔ صاحب جب اصغرؔ صاحب سے گونڈہ ملنے گئے اس لئے کہ شاید ان کی صحبت میں سکون ملے۔ انکے تعلقات بیوی سے ختم ہوچکے تھے۔ شراب کثرت سے پینے لگے تھے لوگ ان کی مے نوشی سے عاجز تھے۔ اصغرؔ مرحوم سے جب جگرؔ صاحب نے اپنا دردِ دل بیان کیا اور اپنی خانگی پریشانیوں کا ذکر کیا تو انھوں نے انکے دُکھے دل پر مرہم رکھا۔ ان کی بے انتہا تسلی و تشفی کی۔ اپنے پیر سے ان کا تذکرہ کیا۔ اور اُن سے فیض حاصل کرنے کے لئے اِن کو اُن کے پاس بھیجا لیکن ان کی مے نوشی کی وجہ سے کئی دور تک شاہ صاحب سے ملنے کا موقع نہ آسکا۔ شاہ صاحب

کی سخت تاکید تھی کہ شراب پی کر میرے سامنے مت آؤ۔ جب کوئی معتقد ان کی شراب کو پھینکنے کی کوشش کرتا تھا تو وہ جام و مینا سے اور چمٹ جاتے تھے اور کہتے تھے ؎

اے محتسب نہ پھینک مرے محتسب نہ پھینک ظالم شراب ہے ارے ظالم شراب ہے

لیکن اس کے باوجود بھی اُنھوں نے یہ عہد کیا کہ آئندہ سے شراب نہ پئیں گے، شاہ صاحب کے مرید ہوئے۔ کچھ دن تو شراب سے تنفر رہا، لیکن پھر اس میں مست رہنے لگے۔ اصغر مرحوم نے جب دیکھا کہ ان کی حالت حد سے زیادہ خراب ہو رہی ہے تو ان کو پابہ زنجیر کرنے کے لئے اپنی چھوٹی سالی سے ان کا عقد کرا دیا۔ اس غریب نے جگر مرحوم کی ہر ممکن دلدہی کی لیکن ان کو راستی پر نہ آنا تھا نہ آئے مثل ہے پڑی ہوئی عادت کہیں چھوٹتی ہے۔ مہینوں گھر سے غائب رہتے اور اپنی کوئی خبر نہ دیتے کہ کہاں ہیں۔ گھر میں فاقوں کی نوبت آجاتی۔ بالآخر بیوی نے طلاق لے لی۔ 'دردمنت کشِ دوا نہ ہوا، بلکہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ پہلی بیوی سے اصغر مرحوم سے جو اولاد ہوئی وہ صرف ایک لڑکی تھی جس کی شادی ہو گئی جس سے ایک بچہ بھی پیدا ہوا، بعد ازاں دونوں فوت ہو گئے۔ دوسری کوئی اولاد نہ ہوئی اس لئے نسیم (نصیر) کی جگر سے طلاق ہو جانے کے بعد بیوی نے یہ مشورہ دیا کہ نسیم سے (یا نصیر) سے شادی کر لو، اُمید ہے اس سے کوئی اولاد ہو گی۔ اصغر نے اپنی چھوٹی سالی نسیم سے شادی کر لی۔ لیکن وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ اولاد نہ تو جگر ہی سے کوئی ہوئی اور نہ نسیم اصغر ہی کو کوئی بچہ دے سکیں (اصغر کے مرنے کے بعد جگر نے پھر اُن سے شادی کر لی تھی)۔

سوچنے سمجھنے کی بات ہے جو شخص مالی مشکلات کے ساتھ ساتھ ازدواجی

زندگی میں بھی ناکام و نامراد رہا ہو اس کا دل و جگر کیا کہتا ہوگا۔ اس ذہنی کرب و بلا کو وہی اچھی طرح جان سکتا تھا جو ان اذیت ناک راہوں سے گذرا ہو۔ اُنھوں نے کیونکر اور کیسے ان تلخ

شکوہ نہ چاہیئے کہ تقاضا نہ چاہیئے — جب جان پر بنی ہو تو کیا کیا نہ چاہیئے
پھر دل میں التفات ہو اُن کے جا گزیں — اک طرزِ خاص رنجشِ بیجا لئے ہوئے

لیکن بقول جگر صاحب " اصغر کی شاعری کا وہ حصہ جو زندگی کے ابتدائی تجربوں سے تعلق رکھتا تھا، نقادوں کے سامنے نہ آسکا۔ یہ حصہ جو چار سال سے کم عمر کا زمانہ تھا ضائع ہوگیا" باون برس کی کل عمر میں اصغر مرحوم کا جو کلام سامنے آیا بھی اس میں ۲۰ برس کا کلام نظروں سے اوجھل ہی رہا۔ عمر کے بقیہ سالوں میں جو پندرہ برس کا زمانہ اہلِ نظر کے سامنے آتا بھی ہے۔ اُن میں سے دو برس فالج کی جان لیوا بیماری کی نذر ہو جاتے ہیں۔ تیرہ برس کا شعری سرمایہ جو لوگوں کے ہاتھ آیا اس میں عمر اور تجربات کی پختگی نے جذبات اور احساسات میں وہ حرارت باقی نہیں رکھی جس سے رندی و سرمستی کی بو آتی۔ ایسی عمر میں جس عمر کا کلام ناقدین کے زیرِ غور رہا فطری طور پر اس عمر میں انسان میں یہ صلاحیت اور شعور پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اب خامکار نہیں ہے۔ جو بات وہ کرتا یا کہتا ہے اس میں ایک طرح کا احساس بڑکپن پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ اصغر کے کلام میں جوانی کی وہ رعنائیاں اور رنگینیاں نہیں مل سکتی ہیں جن کی ناقدین کو تمنا تھی پھر بھی اصغر کے گھریلو حالات کو دیکھتے ہوئے انکی معاشی پریشانیوں پر نظر رکھتے ہوئے انکے دلی جذبات کا احساس کرتے ہوئے ہم کو ان کے

کلام کے اندر جو جاذبیت، جو جوش، جو گداز اور جو لطافت ملتی ہے وہ ہم کو ایک ایسا کیف اور سرور بخشتی ہے جس سے ہماری روح میں توانائی اور بالیدگی پیدا ہوتی ہے

اصغر مرحوم کے مالی وسائل اچھے نہ تھے تلاش معاش میں عرصۂ دراز تک سرگرداں رہے۔ لیکن کسی ایک روزگار پر کاربند نہ رہے۔ ہندوستان اکیڈیمی میں جب ان کو ملازمت ملی تو پھر وہ الہ آباد میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ ملازمت کی ذمہ داریاں بھلا اتنا وقت کب دیتی تھیں کہ وہ سکون کے ساتھ شعر و شاعری پر اپنا وقت مرکوز کریں اس پر خانگی جھگڑے اور مذہبی تقاضے الگ انکو اپنے شکنجوں میں جکڑے ہوئے تھے یہ اصغر مرحوم ہی کا دل تھا جو موجِ حوادث سے ہنستے کھیلتے گذر رہے تھے۔ رنج و غم، دکھ سکھ، آلام و مصائب، تکلیف و پریشانیاں تو ہر ایک کے ساتھ لازم و ملزوم کی طرح ہیں۔ انسان زندگی میں ان حادثات سے دوچار ہوتا ہی رہتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کوئی اُنھیں ہنس کر برداشت کرتا ہے اور کوئی رو کر۔ اصغر و جگر دونوں اس راستہ سے گذرے ہیں، دونوں میں چولی دامن کا ساتھ بھی رہا ہے دونوں نے اپنی زندگیاں بڑی بے کسی اور بے بسی سے گذاری ہیں۔ لیکن ایک نے اپنے مداوائے غم کے لئے شراب کو اپنا آلۂ کار بنایا دوسرے کو عجز و نیاز میں طمانیتِ قلب نظر آئی۔ جگر نے ناکامیوں کا سہارا لیا اور اس طرح گویا ہوئے ؎

ہم نے ناکامیوں کو ڈھونڈ لیا　　آخرش کامیاب ہونا تھا

جام اپنے حلق میں انڈیلے ہوں گے اس پر بھی انکے چہرے پر غم و اندوہ کی جگہ مسکراہٹ کھیلتی رہی، کہتے ہیں ؎

مجھ کو اصغر کم ہے عادت نالہ و فریاد کی

جگر کی طرح وہ بھی بہک سکتے تھے، اپنے غموں کا مداوا وہ بھی شراب سے کر سکتے تھے۔ جگر صاحب نے مزے کی خاطر کبھی شراب کو منھ نہیں لگایا۔ مداوائے غم کے لئے اس کو انھوں نے اپنا آلۂ کار بنایا تھا۔ اصغر صاحب کے غم تو جگر مرحوم کے غموں سے کہیں زیادہ تھے لیکن ان کی مذہبی سرشت ہمیشہ ان کے آڑے آئی۔ ان کو جو سکون عجز و نیاز میں ملا وہ جگر مرحوم کو شراب میں کبھی نہ ملا۔ ایسی حالت میں دراصل اصغر کو بہت ہی خشک اور چڑچڑا بن جانا چاہیئے تھا لیکن ان کی زندہ دلی ہر حال میں ان کی رفیق کار رہی۔ کہتے ہیں ؎

وہ موت ہے کہ کہتے ہیں جس کو سکون سب	وہ عین زندگی ہے جو ہے اضطراب میں
سارے عالم میں ہے بیتابیٔ و شورش برپا	ہائے اُس شوخ کا ہم شکل تمنّا ہوتا
غمِ لا انتہا سعیٔ مسلسل شوق بے پایاں	مقام اپنا سمجھتے ہیں نہ ہم منزل سمجھتے ہیں
مار ڈالے گی مجھے عافیت کنجِ چمن	جوشِ پرواز کہاں جب کوئی صیاد نہ ہو
اس طرح بھی کوئی سرگشتہ و برباد نہ ہو	اک فسانہ ہوں جو کچھ یاد ہو کچھ یاد نہ ہو
اس چمن میں آگ برسے گی کہ آئے گی بہار	اک لہو کی بوند کیوں ہنگامہ آراد لمیں ہے
طبیعت خود بخود آمادۂ وحشت تھی اے اصغر	ہوائے فصلِ گل نے اور بھی اس پر قیامت کی
مجھ کو نہیں ہے تاب خلش ہائے روزگار	دل ہے نزاکتِ غمِ لیلیٰ لئے ہوئے

ایسے حالات میں اصغر مرحوم جو کچھ کہہ سکے غنیمت ہی تھا۔ عمر کی پختگی کیسا تھ "نشاطِ روح" میں جو گرمی ملتی ہے وہ "سرودِ زندگی" میں مفقود نظر آتی ہے۔ سرودِ زندگی کی غزلیات پر مشتمل مجموعہ انکی شاعری کا دوسرا اور آخری مجموعہ ہے۔ سنہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۳ء تک کا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں اُن پر فالج کا آخری شدید حملہ ہوا۔ جس نے ان کے

چراغِ ہستی کو ہمیشہ کے لئے گُل کر دیا۔

یہ انسانی کمزوریاں ہیں کہ انسان جس طرح سوچتا ہے ان کو بعینہ بروئے کار نہیں لا پاتا۔ اصغر مرحوم اپنی شاعری میں جو نکھار اور بانکپن پیدا کرنا چاہتے تھے اس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے اور نہ معرفت و حکمت کے جو دقیق اسرار اس میں سمونا چاہتے تھے۔ سمو سکے بقول ان کے ؎

اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا　　　اشعار میں سُنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہیں

"سرودِ زندگی" اصغر مرحوم کا ایک چھوٹا سا مجموعہ ہے جو انکے شاعرانہ خیالات و افکار کا آخری نچوڑ ہے۔ کہنے کو تو غزلیات ہیں لیکن در اصل ان میں منظومات کا رنگ جھلکتا ہے چھوٹی تقطیع پر ۱۰۲ صفحات پر مبنی ہے سب سے پہلا شعر جو اس مجموعہ میں ہے وہ ؎

ترکِ مدعا کر دے عینِ مدعا ہو جا　　　شانِ عبد پیدا کر مظہرِ خدا ہو جا

خالص فلسفہ تصوف پر مبنی ہے شاعر تلقین کرتا ہے کہ خواہشات نفسانی اور حرص و آز کو چھوڑ دے جس قدر خواہشات بڑھتی رہیں گی اُسی قدر تو خدا سے دُور ہوتا رہے گا۔ اور اس طرح یہ افکار زندگی تجھے خدا کی یاد سے باز رکھیں گے۔ لیکن اگر تو اپنے مدعات کو ترک کرے گا اور قانع ہو جائے گا تو تجھے سکونِ قلب مِل جائے گا۔ اور جب سکونِ قلب ہو گا تو پھر تجھے یادِ خداوندی میں لطف آئے گا۔ اس طرح سچی عبادت سے ایک دن وہ آئے گا جب تیرے اندر خدا کا جلوہ پذیر ہو گا۔ اور تجھ سے انواع و اقسام کی کرامتیں صادر ہوں گی۔ اس پوری نظم میں شاعر نے فلسفہ و تصوف سے کام لیا ہے اور حقائق و معرفت پر روشنی ڈالی ہے عمل کرنے کی تلقین کی ہے۔ برگِ گل

کے دامن پر رنگ بن کر جمنے کو منع کیا ہے بلکہ اس فضائے گلشن میں موجۂ صبا بننے کی تلقین کی ہے۔

دوسری غزل میں کہتے ہیں کہ جب ہمارا سجود اتنا بڑھ گیا کہ ہم کو بتوں کی صف سے نجات مل گئی تو پھر بتوں کی صف سے انا المعبود کا نعرہ اٹھا۔ دوسرے شعر میں کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص فنا فی اللہ ہو گیا تو وہ شخص زماں و مکاں کی قیود سے آزاد ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں شاعر سوال کرتا ہے کہ خرد اور اس کا نظام کار کہاں ہے کیونکہ نرگس خمار آلود کو تو خرد اور اس کے نظامِ کار میں کوئی فرق نظر نہیں آتا ہے وہ تو تو من شدی من تو شدی کے مصداق ہے۔ آگے چل کر شاعر نے یہ کہا ہے کہ جب تو فنا فی اللہ ہو گیا اور جس طرح قطرہ دریا میں مل کر اپنا وجود ختم کر دیتا ہے۔ اسی طرح تو فنا فی اللہ ہو کر ذاتِ خداوندی کا ایک جزو ہو گیا اور جب تو اس کا جزو ہو گیا تو تجھ پر مظہرِ خداوندی پیدا ہو گیا اس طرح تو نے خدائی مظاہر کو عرش سے لا کر فرش پر رکھ دیا اور اس طرح شہود غیب ہو گیا اور غیب جو تھا عالمِ نگاہ میں آ گیا۔

تیسری غزل میں انھوں نے اپنے سے سوال کیا ہے کہ میں کیا ہوں یہ رازہائے سربستہ ہیں جن کے انکشافات وقتاً فوقتاً فلسفیوں نے اپنی اپنی زبان میں کئے ہیں۔ شاعر نے بھی اپنے علمی و عقلی دلائل سے اس عقیدہ نافہم کو وا کرنے کی کوشش کی ہے کہتا ہے کہ میں نے علم و معنی کے تمام اوراق کو الٹا پلٹا لیکن اس راز کا ابھی تک پتہ نہ لگا سکا کہ انسان کی حقیقت کیا ہے اپنی اس نظم میں وہ مختلف طرح کے سوالات کرتا ہے اور اس پر روشنی ڈالتا ہے لیکن مثل

مشہور ہے کہ فلسفی کو بحر کے اندر خدا ملتا نہیں۔ بالآخر تھک کر کہتا ہے کہ مجھے یہ فرصت کاوش کہاں کہ کیا ہوں میں لیکن اسکے باوجود بھی اسکا دل اُسے بیچین کئے ہوئے ہے، وہ اپنی ہزیمت تو تسلیم کرتا ہے لیکن ناامید نہیں ہے، کہتا ہے ؎

کہاں ہے سامنے آ مشعل یقیں لے کر   فریب خوردۂ عقلِ گریز پا ہوں میں

آگے چل کر شاعر نے قومِ مسلم سے خطاب کیا ہے اس نظم میں بھی وہی تصوّف اور فلسفہ کی گہرائی و گیرائی ہے۔ آپ بھی دیکھیں کہ شاعر کی نظر میں قومِ مسلم کیا تھی اور اب کیا ہوگئی۔ شاعر کا دل اپنی قوم کی اس زبوں حالی پر دکھتا ہے وہ کہتا ہے ؎

کہاں اے مسلمِ سرگشتہ تو محوِ تماشہ ہے
جب اس آئینہ ہستی میں تیرا ہی سراپا ہے
تجھ ہی سے اس جہاں میں ہے بنا آئین و حکمت کی
کہ سب مے کی بدولت اصطلاحِ جام و مینا ہے

اس طرح قوم کو جھنجھوڑنے کے بعد کہتے ہیں ؎

جو ہو للّٰہیت تو دین بن جاتی ہے یہ دنیا   اگر اغراض ہوں تو دین بھی بدتر ز دنیا ہے

پھر فرض کا احساس اس طرح کراتے ہیں ؎

فرائض کا ہے احساس عالم کے مظاہر میں   یہی عارف کا مقصد ہے یہ شارع کا ایما ہے

اس کے بعد ان کی دوسری نظم کا عنوان ہے ؏

آج بھی کچھ کمی نہیں جنبشِ برقِ طور میں

اس میں بھی وہی فلسفہ و حکمت کے رازہائے سربستہ کا انکشاف ہے، کہتے ہیں یہ ؎

خیر گئی نظر کے ساتھ ہوش کا بھی پتہ نہیں   اور بھی دور ہوگئے آکے ترے حضور میں

اس کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ انسانی معلومات بغیر رضئی سولاطے نہیں ہو جاتے ہیں بلکہ چشمک برق قدم قدم پر راہ روکے ہوئے ہے۔ جبرؔ آگر اپنے کو یوں سپردگی میں دے دیتے ہیں ؎

تری ہزار برتری تری ہزار مصلحت
میری ہر ایک شکست میں مری ہر ایک قصور میں

ع کوئی کھینچے لئے جاتا ہے خود جیب و گریباں کو

اس میں بھی فلسفہ و تصوف کی باتیں ہیں لیکن تابش جمال اور ذوقِ عصیاں نے مجازی کیفیت پیدا کرکے شعر کو رنگین بنا دیا ہے ؎

سُنا ہے حشر میں شانِ کرم بیتاب نکلے گی
لگا رکھا ہے سینہ سے متاعِ ذوقِ عصیاں کو

نہیں دیوانہ ہوں اصغرؔ نہ مجھ کو ذوقِ عریانی
کوئی کھینچے لئے جاتا ہے خود جیب و گریباں کو

ع ساغر بکف گرے تو سنبھلنا نہ چاہیے

اس کی رنگینیت ملاحظہ ہو ؎

شکوہ نہ چاہیے کہ تقاضہ نہ چاہیے
جب جان پر بنی ہو تو کیا کیا نہ چاہیے

ٹھہرے اگر تو منزلِ مقصود پھر کہاں
ساغر بکف گرے تو سنبھلنا نہ چاہیے

اصغرؔ صنم پرست سہی پھر کسی کو کیا
اہلِ حرم کو کاوشِ بیجا نہ چاہیے

ع ایک تازہ زندگی ہے ہر ایک انقلاب میں

اس غزل کے بھی اشعار ملاحظہ ہوں ؎

وہ موت ہے کہتے ہیں جسکو سکون سب
وہ عین زندگی ہے جو ہے اضطراب میں

میں اضطرابِ شوق کہوں یا جمالِ دوست
اک برق ہے جو کوند رہی ہے نقاب میں

ع بکھرا دیئے ہیں کچھ مہ و انجم جواب میں

مفسرِ حیات نے تلاشِ زندگی پر کیا خوب روشنی ڈالی ہے ؎

اب کون تشنگانِ حقیقت سے یہ کہے　　ہے زندگی کا راز تلاشِ شراب میں
اصغرؔ غزل میں چاہیئے وہ موجِ زندگی　　جو حُسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں

اس کے بعد کی نظم میں شاعر کہتا ہے ؎

ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر　　تم نے تو مُسکرا کے رگِ جاں بنا دیا
کہتے ہیں ایک فریبِ مسلسل ہے زندگی　　اس کو بھی وقفِ حسرت و حرماں بنا دیا

کون کہتا ہے کہ اصغرؔ کے یہاں حُسن و عشق کی گرما گرمی نہیں ہے صرف فلسفہ و تصوّف کی بھرمار ہے ۔ ملاحظہ ہو ؎

اشک اب نہیں تھمتے دل پر اب نہیں قابو　　خود کو آزما بیٹھے مجھ کو آزمانے سے
اب جو کچھ گذرتا ہو جان پر گذر جائے　　جھاڑ کے اُٹھے دامن اس کے آستانے سے
زخم آپ لیتا ہوں لذتیں اُٹھاتا ہوں　　تجھ کو یاد کرتا ہوں درد کے بہانے سے

سرودِ زندگی کی دیگر غزلیات کا رنگِ سخن بھی ملاحظہ ہو ؎

محو ہے ذوقِ دید بھی جلوۂ حُسنِ یار میں　　ایک شعاعِ نور ہے اب یہ نظر نظر نہیں
اب وہ قیل و قال ہے اب وہ ذوق و حال ہے　　میرا مقام ہے وہاں میرا جہاں گذر نہیں
اسکی نگاہِ مہر خود مجھ کو اُڑا کے لے چلی　　شبنمِ خستہ حال کو حاجتِ بال و پَر نہیں
کچھ ملتے ہیں اب پختگیٔ عشق کے آثار　　نالوں میں رسائی ہے نہ آہوں میں اثر ہے
یوں نہ اس دورِ خزاں کو بے حقیقت جانیئے　　پرورش پائی ہے اُس نے زیرِ دامانِ بہار
یا تو خرد کو ہوش کو مستی و بیخودی سکھا　　یا نہ کسی کو ساتھ لے اسکے حریمِ ناز میں
اب وہ زماں نہ وہ مکاں اب وہ زمیں نہ آسماں　　تم نے جہاں بدل دیا آ کے مری نگاہ میں

گوشہ گوشہ علم و حکمت کا ہے سب دیکھا ہوا
یہ غنیمت ہے درِ میخانہ اب تک باز ہے

جس پہ بتخانہ تصدق جس پہ کعبہ بھی نثار
ایک صورت ایسی سنتے ہیں کہ بتخانہ میں

بڑا ہے کیا اسکے در پہ اصغر وہ شوخ مائل ہے امتحان کہ
ثبوت دے زندگی کا مر کر نیاز اب کا اگر نہیں ہے

لوگ مرتے بھی ہیں جیتے بھی ہیں بیتاب بھی ہیں
کون سا سحر تری چشم عنایت میں نہیں

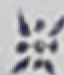
اصغر مرحوم کا کلام کیا ہے اور کیسا ہے، سرودِ زندگی کے مندرجہ بالا اشعار سے آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں لیکن حقیقت تو ہے کہ اس کلام میں فلسفہ و حکمت کے حقائق و معارف اگر ایک طرف ہیں تو دوسری طرف حسن و عشق اور جام و مینا کی رندی و مستی بھی پوری طرح جلوہ گر ہے ان کی جادو بیانی تو یہی ہے کہ وہ نالۂ و فریاد، یاس و حسرت کے پُر شور میدانوں سے اس طرح گزر جاتے ہیں کہ نہ تو کانوں کو ان کی شوریدگی کا احساس ہوتا ہے اور نہ ان کی رفتار و گفتار سے دل و دماغ بوجھل ہوتے ہیں بلکہ اُن سے ایک ایسا سرور و کیف ملتا ہے جس سے روح میں توانائی اور بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ ان کے دل گداز اشعار نہ تو یاسیت و قنوطیت کو دل میں جگہ دیتے ہیں۔ اور نہ پست ہمّت ہی بناتے ہیں۔ ان کا کلام نہ تو بالکل آفاقی ہی ہے اور نہ فحاشی ہی۔ ان کے کلام میں عشق و محبت کا درد و لبت بھی ہے۔ اور جام و مینا کا کیف بھی۔ ان کے اشعار نہ تو زاہد خشک کے پند و نصائح ہیں اور نہ پیرِ مغاں کے چھلکتے جام۔

جہاں تک معائب و محاسن کا تعلق ہے حقیقت تو یہ ہے کہ کسی شاعر کا کلام اس سے خالی نہیں۔ غالب کو لیجئے۔ جس کلام کو انھوں نے اپنے لئے ننگ و عار سمجھا لوگوں کو اُس نے گرویدہ کیا۔ اس لئے اچھائی بُرائی جانچنے کے لئے انسان

کا الگ الگ مذاق اور ذوق ہوتا ہے اس کا اپنا نقطۂ نظر اور معیار ہوتا ہے ایک ہی لاٹھی سے یا ایک ہی کسوٹی پر نہ تو سب کو ہانکا جا سکتا ہے اور نہ کسا جا سکتا ہے!

اصغر جس طرح ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اُس طرح اُنھوں نے اپنی رفتار و گفتار میں یکسانیت برتی۔ اپنے ذوقِ حسُن اور تخیل حسن سے اپنے اندر وہ ایک ایسی انفرادیت رکھتے تھے، جو دوسروں کے دلوں کو موہ لیتی تھی۔

سرودِ زندگی دراصل شاعر کا ایک ایسا کلام ہے جس کے اندر نہ صرف آدمیت ہی آفاقیت ہے بلکہ اس کے اندر کام و دہن کے لئے حسُن و عشق کی چاشنی بھی ہے گل و بلبل کے افسانے بھی۔ جوش و خروش کی سرمستیاں بھی اور عقل و خرد کے رازہائے سربستہ بھی لیکن ہر ایک چیز اپنے اپنے ذوق و نظر پر منحصر ہے کوئی کانٹوں سے پھولوں کو اس طرح جدا کر لیتا ہے کہ کانٹے اس کا کچھ بگاڑ نہیں پاتے اور کوئی کانٹوں میں اس طرح اُلجھ جاتا ہے کہ اُس سے دامن محفوظ رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔



حضرت مولانا اصغرؔ گونڈوی

دیوان رگھوناتھ خطیب سرمدی

ساجد بھائی، تمہارا خط ۱۵ر جولائی کا ملا۔ حضرت مولانا اصغرؔ گونڈوی کی کلیات ضرور چھاپو، یہ تو مجھ پر بڑا بھاری احسان ہوگا۔ میں جتنا اصغرؔ کے کلام سے متاثر ہوں کسی دیگر کے کلام سے نہیں۔ وہ شاعر بے بدل تھے۔ کئی شعراء کے دیوان بھی انکے ایک شعر سے ہلکے ہیں۔ جس نے اصغرؔ کے کلام کو سمجھا نہیں وہ ضرور معترض ہو سکتا ہے۔ میرا ارادہ تو اصغرؔ کے سرودِ زندگی کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کا ہے۔ اور رام لال صاحب کمال کے ذہن میں آل ورلڈ اُردو کانفرنس کرنے کا تخیل ہے۔ اور اُسی اُردو کانفرنس میں اُس انگریزی ایڈیشن کو پیش کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

تمہارے خط کے آنے سے تحریک ہوئی اور حضرت مولانا اصغرؔ کے بارے میں چند سطور قلمبند کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

نقادِ اعظم حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ (فخر انسانی) نے جس شاعر کے کلام کی توصیف کی ہو اور اُس کے وجود سے کافی عرصہ تک لاعلمی کی شکایت کی ہو اور اس امر کو اپنی بدقسمتی پر محمول فرمایا ہو تو ایسے شاعر کو ہم شاعرِ اعظم نہ کہیں تو یہ ہماری کم ظرفی ہوگی۔

اصغر تو شاعرِ اعظم تھے۔ شاعرِ بے بدل تھے۔ جسے شاعرِ اعظم کہا گیا۔ اور جو گیتانجلی لکھ کر غیر فانی ہوگیا۔ اُس کی عظمت سے کسے انکار ہے۔ لیکن اصغر کے چند اشعار میں ہی گیتانجلی کا متن واضح ہوجاتا ہے۔

زندگی کا جتنا گہرا مطالعہ، زندگی کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ جس انداز سے اصغر کے کلام میں ملتا ہے وہ بہت کم شعرائے کے حصہ میں آیا ہے۔

اَب میں حضرت اصغر کے اشعار کی تشریح کروں تو اچھا نہیں معلوم دیگا کلیات آپ کے سامنے ہیں حسب منشا مطلب نکالئے لیکن پھر رہا نہیں جاتا۔ کس شاعر نے منصور کے رُتبہ کو اتنا بلند کیا اور اُس سانحہ عظیم کو اس خوبصورتی سے پیش کیا ہے ؎

بس اتنے پر ہُوا ہنگامۂ دار و رسن برپا
کہ لے آغوش میں آئینہ کیوں مہر درخشاں کو

اَب آئینے کی تو فطرت ہے عکس لینا۔ اور انسان قدرت کا آئینہ ہے اگر آئینے نے مہر درخشاں کا عکس لے لیا تو دیکھنے والا اُسے مہر درخشاں ہی کہے گا۔ اور کچھ تو نہیں کہے گا۔ تو پھر اُس نے انا الحق کہہ ہی دیا تو کیا غضب کیا؟

"کیا ہوں میں" آپ کلیات میں پڑھیں گے انسان کے بارہ میں ہر فلسفہ

کی بنیاد پر ایک ایک شعر کہہ دیا ہے۔ عظمتِ انسانی آسمان کی بلندیوں کو چھُو رہی ہے۔ لیکن یقینِ کامل کو ایمان کی بنیاد اور کل تخیلات کا سر دار مانا ہے فرماتے ہیں ؂

کہاں ہے سامنے آ مشعلِ یقیں لیکر　　فریب خوردۂ عقلِ گریز پا ہوں میں

اور ؂

اُڑا ہوں جب تو فلک پر لیا ہے دم جا کر　　زمیں کو توڑ گیا ہوں جو رہ گیا ہوں میں

اور پھر آخر میں سب کا حل کس خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں ؂

ترا خیال ہے ترا جمال ہے تو ہے
مجھے یہ فرصتِ کاوش کہاں کہ کیا ہوں میں

حضرت گیتا کے فلسفہ کرم یوگ سے بے حد متاثر تھے فرماتے ہیں ؂

یہاں کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہاں صیاد ہوتا ہے

اور پھر ؂

کوئی محمل نشیں کیوں شاد یا ناشاد ہوتا ہے
غبارِ قیس خود اُٹھتا ہے خود برباد ہوتا ہے

علامہ اقبال فارسی میں فرماتے ہیں ؂

بُو علی اندر غبارِ ناقہ گُم
دستِ رومی پردۂ محمل گرفت

آپ فرماتے ہیں ؂

یہ عشق نے سمجھا ہے یہ عقل سے پنہاں ہے
قطرہ میں سمندر ہے ذرّہ میں بیاباں ہے

حضرت علامہ اقبال کے اشعار اکثر تواریخی پس منظر لئے ہوئے ہوتے ہیں لیکن حضرت مولانا اصغرؔ نے اسے اور عوامی بنا دیا۔

حضرت امیر خسرو فرماتے ہیں ؎

خلق مے گوئید کہ خسرو بُت پرستی میکند
آرے آرے میکنم با خلق و عالم کار نیست

لیکن اصغرؔ کا شعر اس سے بہت بلند ہے ؎

اصغرؔ صنم پرست سہی پھر کسی کو کیا　　اہلِ حرم کو کاوشِ بیجا نہ چاہیئے

اِس کاوشِ بیجا کا جواب کہیں نہیں ہے۔

آہ کس طریقے سے تفریقِ مذہب کے مسئلے کا حل پیش کیا ہے ؎

جلوۂ ذوقِ عقیدت گرمیٔ حسنِ نیاز　　ورنہ کچھ کعبے میں رکھا ہے نہ بتخانے میں ہے

اور اِس شعر کا جواب کس زبان نے دیا ہے ؎

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا　　جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

برسوں اِس شعر کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہیئے۔ رازہائے سربستہ آپ کھُلتے جائیں گے۔ عرفانیت نزدیک تر آتی جائے گی۔ اور دیکھئے ؎

جس پہ بُت خانہ تصدّق جس پہ کعبہ بھی نثار
ایک صورت ایسی بھی سنتے ہیں میخانہ میں ہے

مستی اور خود آگہی کے لئے اِس سے بہتر مضمون کون باندھ سکتا ہے۔ آدم کی

تڑپ سیمابی کیفیت اِسے زندگی قرار دیا۔ سود و زیاں کی گرفت میں کبھی نہیں
آئے۔ جستجو کو ذوق طلب کو زندگی کا ماحصل قرار دیا ہے

یہ مجھ سے سُن لے رازِ پنہاں سلامتی خود ہے دشمنِ جاں
کہاں سے راہرو میں زندگی ہو جب راہ پُر خطر نہیں ہے

یہ نیگ عاشقی ہیں سود و زیاں دیکھنے والے
یہاں گمراہ کہلاتے ہیں منزل دیکھنے والے

کس انداز سے گناہگاروں کی شفاعت کے بارہ میں فرماتے ہیں ہے

سُنا ہے حشر میں شانِ کرم بیتاب نکلے گی
لگا رکھا ہے سینے سے متاعِ ذوقِ عصیاں کو

اور یہ غور فرمائیے کبھی ادھوری بات نہیں کہتے۔ ہمیشہ پاکیزگی کا دامن تھامے
رہتے ہیں۔ پرستش نہیں کہتے ذوقِ پرستش کہیں گے، نیاز نہیں کہیں گے حُسنِ نیاز
کہیں گے۔ عمل نہیں کہیں گے، ذوقِ عمل کہیں گے۔ عصیاں نہیں کہیں گے،
ذوقِ عصیاں کہیں گے۔ کہیں گرفت کی گنجائش نہیں چھوڑی، پھر زندگی ہے

میں یہ کہتا ہوں فنا کو بھی عطا کر زندگی
تو کمالِ زندگی کہتا ہے مرجانے میں ہے

بہار کی تعبیر سنئے ہے

جوشِ شباب مستیِ صہبا ہجومِ شوق
تعبیر یوں بھی کرتے ہیں فصلِ بہار کو

جہاں یہ تین چیزیں یکجا ہوں تو بہار نہیں تو کیا ہے۔

ہائے ہائے ؎ پہلے ہستی کی جستجو ہے ضرور
پھر جو گم ہو تو جستجو نہ کرے

واہ واہ ؎

رند جو ظرف اُٹھالیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہیں میخانہ بنے

مضمون کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا۔ اصحابِ ذوق کی تسکین کے لئے عمر بھر کے لئے سامان کلیات میں موجود ہے۔ کاغذ کی بے حد گرانی ہے۔ اور مضمون طولانی ہو جائے تو کہیں ساجد پر گراں نہ گذرے۔ ایک شعر آخر میں تحریر کر کے اپنی کم مائیگی اور اُردو سے دلبستگی کے باوجود اہلِ زبان نہ ہونے کے اعتراف کے ساتھ اربابِ ذوق اور اہلیان زبان سے معافی چاہتا ہوں اور معذرت خواہ ہوں کہ اتنے بڑے شاعر کے بارہ میں قلم اُٹھانے کی جسارت کی ہے ؎

راز کی جستجو میں مرتا ہوں
اور میں خود ہوں ایک پردۂ راز



پوری فطرت کو ایک شعر میں بند کر دیا ہے ؎

میخانۂ ازل میں جہانِ خراب میں
ٹھہرا گیا نہ ایک جگہ اضطراب میں

مجھ سے زیادہ آگاہ لوگوں کے پاس شائد اس شعر کا جواب ہو لیکن میری کم مائیگی گواہ ہے کہ فارسی، ہندی اور اُردو شعراء میں سے کسی نے ایسا مضمون اس طریقے سے نہیں باندھا۔

پھر آشیانے کا مضمون ملاحظہ فرمائیے ؎

اک ایک تنکے پہ ہے سوختگی طاری
برق بھی لرزتی ہے میرے آشیانے سے

آہا۔ رُخِ جاناں کے بارے میں ملاحظہ فرمائیے ؎

نظر وہ ہے کہ جو کون و مکاں کے پار ہو جائے
مگر جب روئے تاباں پر پڑے بیکار ہو جائے

سحر لائیگی کیا پیغام بیداری شبستاں میں
نقابِ رُخ اُلٹ دو خود سحر بیدار ہو جائے

ناکامیاں، مایوسیاں، محرومیاں اصغرؔ کے ایک دو شعر پڑھ کر معدوم ہو جاتی ہیں ؎

سارا حصول عشق کی ناکامیوں میں ہے
جو عمر رائیگاں ہے وہی رائیگاں نہیں

بتائیے انسان کی اس سے بہتر تفسیر کیا ہوگی ؎

وہ شورشیں نظامِ جہاں جن کے دم سے ہے
جب مختصر کیا اُنھیں انسان بنا دیا